خوارج کی حقیقت

تالیف: فیصل بن قزار الجاسم

ترجمہ وتلخیص: حفظ الرحمن لکھوی





خوارج کی حقیقت

تالیف: فیصل بن قزار الجاسم

ترجمہ و تلخیص: حفظ الرحمن لکھوی

سرورق .... ظہیر الدین بابر
تزئین .... محمد شفیق
کمپوزنگ .... محمد بن جعفر



دار الاندلس
4- لیک روڈ چوبرجی لاہور +92-42-37230549
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور +92-42-37242314
بالمقابل سفاری پارک گلشن اقبال کراچی +92-21-34835502
Head Office : Cell + 92-322-4006412 Email: dar_ul_andlus@yahoo.com

خوارج کی حقیقت

عرضِ ناشر

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، اَمَّا بَعْدُ!

مسلمانوں کو اندرونی طور پر سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا اور امت مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والا فتنہ، فتنۂ تکفیر اور فتنۂ خوارج ہے۔ ان افکار کے حامل بعض گمراہ اور فتنہ پرور لوگ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کی نفرت انگیز تصویر پیش کر کے انھیں دینِ اسلام سے متنفر کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کا سب سے بڑا ہدف اور نشانہ مسلم معاشرے ہوتے ہیں اور مسلمانوں کو کافر قرار دے کر انھیں قتل کرنے کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ اس سوچ کے نتیجے میں مسلمانوں کا قتل، ان کی عزت اور مال لوٹنے کے فتوے دیے جاتے ہیں، اس ظالمانہ اور سفاکانہ جرم کے ذریعے اسلام کا خوف ناک، سنگ دل اور نفرت انگیز چہرہ پیش کر کے مسلمانوں کو بدنام کر رہے ہیں۔

گزشتہ چند دہائیوں سے اس خطرناک اور ہلاکت خیز فتنے نے پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور ان کا نشانہ خاص طور پر مسلمانوں کی نوجوان نسل ہے۔ جنھیں کتاب و سنت کی تعلیمات اور دینی علوم وفنون سے ناواقف اور سلف صالحین کے منہج سے متحارب نام نہاد مفتیان گمراہ کر رہے ہیں اور قرآن وحدیث اور اسلامی اصطلاحات کی من مانی تشریحات و تعبیرات کے ذریعے خود بھی گمراہ ہو رہے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں۔

ان پریشان کن حالات میں امت مسلمہ کے سامنے صحیح اسلامی تعلیمات پیش کر کے ان کی راہ نمائی کرنا علمائے حق کی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے

ادارہ دارالاندلس فتنۂ تکفیر اور فتنہ خوارج کے موضوع پر مختلف علمائے کرام کی تالیف کردہ متعدد کتب اور کتابچے مطبوعہ شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش کر چکا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیصل بن قزار الجاسم کی عربی تصنیف ''حقیقۃ الخوارج'' کا ترجمہ ہے۔ جس میں فتنۂ خوارج کی طرف سے مختلف ادوار میں پہنچنے والے نقصانات کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ و تلخیص فاضل دوست فضیلۃ الاستاذ حفظ الرحمٰن لکھوی ﷾ نے کیا ہے۔ ان کا اسلوب آسان اور سلیس ہے۔ جس میں انھوں نے اصطلاحات وتعبیرات کا شاندار ترجمہ کیا ہے، تاکہ نفس مضمون اور نص عبارت کا مفہوم مکمل اور بہتر انداز میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ ان کی سعی جمیل کو قبول و منظور فرمائے۔

اس کتاب کی پروف ریڈنگ حافظ محمد آصف مدنی، حافظ ثناء اللہ خاں، پروفیسر منشاء طیب اور یاسر فاروق نے کی ہے اور ترتیب و تزئین محمد شفیق نے کی ہے۔ اس کا خوبصورت سرورق ظہیر الدین بابر نے تیار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام احباب کو جزائے خیر سے نوازے اور مصنف و مترجم کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین!

محتاجِ دعا

جاوید الحسن صدیقی

مدیر دارالاندلس

۲۲ صفر ۱۴۳۷ھ

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی أَشْرَفِ الْمُرْسَلِیْنَ وَ سَیِّدِ الْأَوَّلِیْنَ وَالْآخِرِیْنَ، نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ، وَ عَلٰی آلِہٖ وَ صَحْبِہٖ وَمَنِ اقْتَفٰی أَثَرَہٗ وَ اتَّبَعَ سُنَّتَہٗ إِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ، وَ بَعْدُ!

آج اگر اہل اسلام کے حالات میں غور وفکر کیا جائے اور دنیائے اسلام کے طول وعرض پر نظر ڈالی جائے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جس فتنے نے مسلمانوں کو پے در پے مصائب و آفات میں مبتلا کر رکھا ہے، ہر طرف عام ہو چکا اور شدت اختیار کر چکا ہے، وہ فتنۂ خوارج ہے۔ یہ (خوارج) وہ لوگ ہیں جو جسد امت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور اس کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، حتیٰ کہ امت مسلمہ میں اس فتنے کی وجہ سے قتل و غارت کا بازار گرم ہے اور ان لوگوں کے شر و فساد کی وجہ سے امتِ مسلمہ آج بہت سی بھلائیوں اور خیر خواہیوں سے محروم ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کم علم اور بے وقوف خارجیوں کے فتنوں اور شر سے محفوظ رکھے۔ آمین!

امت مسلمہ کی خیر خواہی اور ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کا تقاضا ہے کہ اس گمراہ ٹولے کا (صراطِ مستقیم سے) انحراف واضح کیا جائے اور ان کے فکر و عمل کے خطرے سے لوگوں کو خبردار کیا جائے، تاکہ اس شر و فساد کا راستہ روکا جا سکے اور دین اسلام کو اس رنگ میں جانا اور پہچانا جا سکے جس میں وہ نازل ہوا تھا۔

فتنوں کے دوران ایک پریشان کن صورت یہ بھی پیش آتی ہے کہ عام لوگ انھیں سمجھ اور پہچان ہی نہیں پاتے، سوائے علمائے ربانی کے، جنھیں خداداد بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ عوام کو پتا تب چلتا ہے جب وہ فتنہ تباہی و بربادی پھیلا کر رخصت ہو رہا ہوتا ہے۔

امام نعیم بن حماد نے اپنی مشہور کتاب ''الفتن'' میں یہ حدیث ذکر کی ہے کہ سیدنا حذیفہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ فتنہ جب شروع میں آتا ہے تو اسے (بطورِ فتنہ) سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے، مگر جب وہ اپنی انتہا کو پہنچ کر واپس پلٹتا ہے تو خوب نمایاں اور واضح ہو چکا ہوتا ہے۔ کسی نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اس (فتنے) کے آنے سے کیا مراد ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: ''ہتھیار سونت لینا (یعنی آمادۂ جنگ ہو جانا)۔'' پھر پوچھا گیا کہ اس کے واپس پلٹنے سے کیا مراد ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: ''ہتھیار رکھ دینا (یعنی جنگ بندی)۔''

امید ہے کہ اس کتاب میں آپ کو ایسا مواد مل سکے گا کہ جس سے ان (خوارج) کی پہچان، علامات، اقسام، مذمت، ان کا سدباب اور ان کے انجامِ بد سے آگاہی حاصل ہوگی۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ وہ میری اس کوشش میں اخلاص و برکت پیدا فرمائے۔ اگر قارئین کو اس کتاب میں کہیں کوئی خطا یا لغزش نظر آئے تو آگاہ فرمائیں، ان شاء اللہ میں خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے قبول کروں گا اور اگر اس میں کوئی خوبی اور کمال ہے تو وہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

راقم الحروف
فیصل بن قزار الجاسم
کویت: ۲۰ محرم ۱۴۲۶ھ
21 مارچ 2005ء

فصل اوّل

خوارج کے بارے میں احادیث

① سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے، جبکہ وہ یمن کے گورنر تھے، کچھ سونا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار افراد، اقرع بن حابس حنظلی، عیینہ بن بدر فزاری، علقمہ ابن علاثہ عامری، زید الخیر طائی کے درمیان تقسیم فرما دیا۔ اس پر قریش اور انصار غصے میں آ گئے۔ انھوں نے کہا: ''آپ نجد کے معززین کو تو نوازتے ہیں اور ہمیں محروم کرتے ہیں۔'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے صرف ان کا دل جیتنے کے لیے ایسا کیا ہے۔'' اسی دوران ایک شخص آیا جس کی آنکھیں دھنسی ہوئیں، رخسار ابھرے ہوئے، پیشانی اونچی، ڈاڑھی گھنی اور سر منڈا ہوا تھا کہنے لگا: ''اے محمد! اللہ سے ڈرو۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر میں ہی اللہ کی نافرمانی کرنے لگ جاؤں تو اس کی اطاعت کون کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے تمام اہل زمین کے حق میں مجھے امین بنایا ہے اور تم مجھے امین نہیں مانتے۔'' پھر جب وہ شخص واپس پلٹا تو حاضرین میں سے (راوی کا بیان ہے کہ) غالباً خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کرنے کی اجازت چاہی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا اور فرمایا: ''اس کی نسل میں سے ایسی قوم پیدا ہوگی جو قرآن کی تلاوت تو کرے گی مگر وہ ان کے حلق سے آگے نہیں جا سکے گا، وہ لوگ دین اسلام میں سے یوں نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار سے نکل جاتا ہے، مسلمانوں کو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے۔ اگر وہ مجھے مل گئے تو میں انھیں ایسے قتل کروں گا جیسے عذاب الٰہی کے بعد قوم عاد و ثمود میں سے کوئی بھی بچ نہیں سکا تھا۔''

[بخاري : ٣٣٤٤ ـ مسلم : ١٠٦٤]

② یہی واقعہ دوسری جگہ یوں ذکر ہے، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے کہ اس دوران ذوالخویصرہ [1] (نامی ایک شخص) آیا جس کا تعلق قبیلہ بنوتمیم سے تھا، کہنے لگا: ''اے محمد! عدل کیجیے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرے لیے ہلاکت (کا سامان ہو)! اگر میں عدل و انصاف نہ کروں تو اور کون کرے گا؟ اگر میں بے انصافی کرنے لگ جاؤں گا تو میں ناکام و نامراد ہو جاؤں گا۔'' اس موقع پر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چھوڑ دو، اس (بدبخت) کے کچھ ساتھی ایسے ہوں گے کہ تم اپنی نمازوں اور روزوں کو ان کی نمازوں اور روزوں کے مقابلے میں کم تر سمجھو گے۔ یہ لوگ قرآن تو بہت پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلقوں سے نیچے نہیں اترے گا، دین اسلام سے وہ یوں نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔ اس کے کسی حصے کو بھی دیکھا جائے تو اس پر خون کا کوئی نشان نہیں لگا ہوتا۔ ان کی شناخت ایک سیاہ فام شخص ہے، اس کے دونوں کندھوں میں سے ایک کندھا عورت کے پستان کی طرح یا گوشت کے ہلتے ہوئے ٹکڑے کی طرح ہوگا۔ وہ لوگوں (مسلمانوں) کے باہمی اختلاف کے وقت نمودار ہوں گے۔'' [مسلم : ۱۴۸ / ۱۰۶۴]

③ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمانوں میں افتراق کے وقت تیزی سے نکل جانے والا ایک گروہ نکلے گا، دو جماعتوں میں سے جو جماعت حق سے زیادہ تعلق رکھنے والی ہوگی (وہی) اسے قتل کرے گی۔'' [مسلم : ۱۵۰ / ۱۰۶۵] [2]

④ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب میں تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات بیان

---

[1] ذوالخویصرہ کا معنی ہے، پتلی کمر والا۔

[2] خوارج کی سرکوبی اور بیخ کنی، بعد میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ہوئی۔ [مسلم : ۱۰۶۵]

کروں تو اللہ کی قسم! آپ ﷺ پر افترا پردازی سے مجھے زیادہ محبوب ہے کہ میں آسمان سے نیچے آ گروں، لیکن جب میں اپنے اور تمھارے مابین معاملات کی بابت کچھ کہوں تو پھر بلاشبہ لڑائی دھوکے کا نام ہے۔ میں نے آپ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''آخری زمانے میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو کم عمر اور کم عقل ہوں گے، تمام لوگوں سے بہترین گفتگو کریں گے، قرآن کریم پڑھیں گے لیکن ایمان کا نور ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین سے یوں خارج ہو جائیں گے جیسے تیر اپنے ہدف سے پار ہو جاتا ہے۔ تم جہاں بھی ان سے ملو ان کو قتل کر دو، کیوں کہ ان کے قتل کرنے والے کو قیامت کے دن بہت ثواب ملے گا۔'' [بخاري : ٦٩٣٠]

⑤ زید بن وہب جہنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ اس لشکر میں شامل تھا جو خوارج کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوا۔ (اس موقع پر) سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے لوگو! میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے: ''میری امت میں سے ایک ایسی قوم ظاہر ہو گی جو قرآن پڑھتی ہو گی اور تمھاری تلاوتِ قرآن ان کی تلاوت کے مقابلے میں بے وقعت، تمھاری نماز ان کی نماز کے سامنے بے حیثیت اور تمھارے روزے ان کے روزوں کے مقابلہ میں بے قدر و قیمت ہوں گے۔ قرآن پڑھتے ہوئے وہ یہ سمجھیں گے کہ وہ (قرآن) ان کی تائید میں ہے، حالانکہ وہ ان کے خلاف ہوگا۔ ان کی نماز ان کے حلق سے آگے نہیں جا سکے گی وہ اس طرح تیزی سے دین اسلام سے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔'' اگر وہ لشکر جو انھیں جا لے گا، یہ جان لے کہ ان کے نبی علیہ السلام کی زبان سے ان کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا ہے تو وہ عمل سے (بے نیاز ہو کر صرف اسی پر) بھروسا کریں۔''

[مسلم : ١٥٦/ ١٠٦٦]

⑥ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام عبیداللہ بن ابی رافع بیان کرتے ہیں کہ جب

حروریہ [1] (خوارج) کا ظہور ہوا تو میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ ان کا نعرہ تھا ”اللہ کے سوا کسی کو فیصلے کا حق نہیں۔“ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے (ان کے ردّ میں) فرمایا: ”یہ کلمہ حق ہے جس سے باطل مراد لیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کی علامات بیان فرمائی تھیں، میں ان لوگوں میں ان صفات کو خوب پہچانتا ہوں۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) ”وہ اپنی زبانوں سے حق بات کہیں گے مگر وہ (حق) ان کی اس جگہ (آپ نے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا) سے آگے نہیں بڑھے گا۔ یہ اللہ کے ہاں بدترین مخلوق ہیں۔ ان میں ایک سیاہ فام شخص ہوگا جس کا ایک (کٹا ہوا) بازو بکری کے تھن یا پستان کے سرے جیسا ہوگا۔ [مسلم: ١٥٧/ ١٠٦٦]

⑦ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میرے بعد میری امت میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق سے آگے نہیں جا سکے گا، وہ دین سے یوں نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے، وہ اس دین میں واپس نہیں لوٹ سکیں گے۔ وہ انسانوں اور مخلوقات میں بدترین ہوں گے۔“

[مسلم: ١٠٦٧]

⑧ یسیر بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ میں نے سیدنا سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوارج کا ذکر سنا ہے؟ انھوں نے فرمایا ہاں! میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا تھا اور آپ مشرق (عراق) کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرما رہے تھے: ”(وہاں) ایک ایسی قوم (ظاہر) ہوگی جو اپنی زبانوں سے قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلقوں سے آگے نہیں بڑھ سکے گا، وہ دین سے یوں نکل جائیں گے جیسے تیر اپنے ہدف سے نکل جاتا ہے۔“ [مسلم: ١٠٦٨]

---

[1] خوارج کو ان کے ایک مرکزی علاقے حروراء کی نسبت سے حروریہ بھی کہا جاتا تھا۔

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مشرق کی جانب سے کچھ ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جو قرآن تو پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق سے آگے نہ جا سکے گا۔ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے۔ پھر وہ اس (دین) میں واپس داخل نہ ہو سکیں گے حتیٰ کہ تیر اپنے سوفار [1] میں لوٹ آئے۔ کہا گیا کہ ان کی علامت کیا ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سر منڈوانا، یا فرمایا بالوں کو جڑ سے نیست و نابود کرنا۔'' [بخاری : ۷۵٦۲]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے جو ان کے حلقوں سے آگے نہیں گزر پائے گا۔ ان میں سے جب بھی کوئی سینگ (فتنہ) ابھرے گا، کاٹ دیا جائے گا۔'' سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: ''پھر (آئندہ) جب بھی کوئی فتنہ ان میں اٹھے گا، کچل دیا جائے گا اور بیس سے زیادہ بار ایسا ہوگا، یہاں تک کہ ان کے باقی ماندہ حصے میں دجال کا ظہور ہوگا۔'' [ابن ماجہ : ۱۷٤]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آخری زمانے میں ایک ایسی قوم ہوگی جو قرآن پڑھے گی مگر وہ ان کے حلق سے آگے نہ گزر سکے گا، وہ اسلام سے یوں خارج ہو جائیں گے جیسے تیر شکار سے۔ ان سے جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔'' [مسند أحمد : ۱/۱۵٦، ح ۱۳٤۹]

ابو غالب بیان کرتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ شام میں ایک باغی گروہ پیدا ہوا، پھر وہ سب مارے گئے اور ایک اندھے کنویں میں پھینک دیے گئے۔ (ابو غالب بیان کرتے ہیں کہ پھر) میں اور ابو امامہ دونوں وہاں (کنویں

---

[1] سوفار تیر کے پچھلے حصے میں اس شگاف کو کہتے ہیں جہاں کمان کی تانت اٹکتی ہے، اسے چٹکی بھی کہا جاتا ہے۔ حدیث کا مطلب ہے کہ یہ امر محال ہے۔

کے پاس) گئے، ابو امامہ وہاں رکے، پھر رونا شروع کردیا، پھر فرمایا: ''سبحان اللہ! شیطان نے ان لوگوں (خوارج) کو کیسے بہکایا؟ یہ جہنم کے کتے ہیں، یہ جہنم کے کتے ہیں، یہ جہنم کے کتے ہیں۔ آسمان تلے بدترین مقتول ہیں اور آسمان تلے بہترین شہداء وہ ہیں جو ان (خوارج) کے ہاتھوں مارے گئے۔'' ابو غالب کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: ''اے ابو امامہ! آپ صرف اپنی رائے سے یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں یا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا؟'' فرمایا: ''پھر تو میں بڑا ہی جرأت مند ہوں، پھر تو میں بڑا ہی جرأت مند ہوں، پھر تو میں بڑا ہی جرأت مند ہوں، (اگر میں یہ باتیں اپنی طرف سے کہوں) بلکہ یہ سب کچھ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک یا دو بار نہیں، بیسیوں مرتبہ سنا ہے۔''

میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، آپ فرماتے تھے: ''عنقریب کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق سے آگے نہیں گزر سکے گا۔ اسلام سے یوں نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔ پھر وہ واپس نہیں آئیں گے حتیٰ کہ تیر اپنے سوفار (چٹکی) پر لوٹ آئے۔ (یعنی ایسا ناممکن ہوگا) بشارت ہو اس شخص کو جو انھیں قتل کرے یا ان کے ہاتھوں قتل ہو جائے۔

[الشريعة للآجري : ١/ ٦٨]

⑬ سعید بن جمہان بیان کرتے ہیں کہ میں سیدنا عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا جب ان کی بینائی ختم ہو چکی تھی۔ میں نے انھیں سلام کہا، انھوں نے پوچھا، کون ہو؟ میں نے کہا کہ سعید بن جمہان۔ انھوں پوچھا: ''تمھارے والد کا کیا بنا؟'' میں نے جواب دیا: ''انھیں ازارقہ[1] نے مار ڈالا۔'' انھوں نے فرمایا: ''ازارقہ پر اللہ کی لعنت! ازارقہ پر اللہ کی لعنت! اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتلایا تھا کہ وہ (خوارج) جہنم

---

[1] خوارج کے ایک سردار نافع بن ازرق کی نسبت سے ان کا نام ازارقہ بھی تھا۔

کے کہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ صرف ازارقہ یا سب خوارج ؟ فرمایا: ''سب خوارج (ایسے ہی ہیں)۔''

سعید بن جمہان کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حکمران لوگوں پر ظلم کرتا اور ستم ڈھاتا ہے، تو انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر خوب جھنجوڑا اور فرمایا: '' افسوس اے ابن جمہان! مسلمانوں کی اکثریت کے ساتھ جڑ کر رہو، مسلمانوں کی اکثریت کے ساتھ جڑ کر رہو۔ اگر حکمران تک تیری رسائی ہے تو اس کے گھر جا کر نصیحت کر، پھر اگر وہ تیری بات مان لے تو ٹھیک ورنہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دے، کیونکہ تو اس سے زیادہ (امورِ سلطنت کو) نہیں جانتا۔'' [مسند أحمد : ٤/٣٨٢، ح : ١٩٤٣٤]



فصل ثانی

حکام کی اطاعت کے بارے میں احادیث

① سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اپنے حاکم کی بات) ''سنو اور اس کی اطاعت کرو، خواہ کسی حبشی کو ہی تم پر حکمران بنا دیا جائے، جس کا سر منقی جیسا ہو۔'' [1] [بخاري : ٦٩٣]

② سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے اپنے حکمران کی کوئی چیز (عادت، خصلت) ناپسند ہو تو اسے صبر سے کام لینا چاہیے، کیونکہ جو شخص سلطان (کی اطاعت) سے بالشت بھر بھی دور ہوا، وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔'' [بخاري : ٧٠٥٣]

③ جنادہ بن ابی امیہ ذکر کرتے ہیں کہ ہم سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے جب وہ بیمار تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ اللہ آپ کو صحت عطا فرمائے، ہمیں کوئی ایسی حدیث سنائیں جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نفع پہنچایا ہو اور جسے آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ انھوں نے فرمایا:

''ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا تو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے جن باتوں کا عہد لیا تھا وہ یہ تھیں کہ ہم اپنی پسند اور ناپسند، تنگی اور آسانی کی حالت میں اور اپنی حق تلفی پر (صبر کرتے ہوئے)

---

[1] یعنی چھوٹے سے سر والا اور بدصورت سیاہ فام شخص ہو تو بھی حاکم وقت کی حیثیت سے وہ واجب الاطاعت ہے۔

ہر حال میں (حکمران کی) سمع و طاعت[1] کریں گے اور حکمرانوں سے اقتدار (چھیننے) کی تحریک نہیں برپا کریں گے، سوائے اس حالت میں کہ ہمیں (حکمرانوں میں) کوئی ایسا کھلا کفر نظر آ جائے جس کے بارے میں اللہ کی (شریعت کی) طرف سے واضح دلیل موجود ہو۔ [بخاري : ۷۰۵۵،۷۰۵۶]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان آدمی پر (اپنی پسند و ناپسند) ہر حالت میں (حکمران کی) سمع و طاعت فرض ہے، بشرطیکہ اسے (حکمران کی طرف سے) معصیت (گناہ) کا حکم نہ دیا جائے۔ لہٰذا اگر اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر کوئی سمع و طاعت فرض نہیں۔'' [بخاري : ۷۱۴۴]

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میرے بعد (غیر منصفانہ) ترجیح اور ایسی اشیاء ہوں گی جنھیں تم سخت ناپسند کرو گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہم میں سے جسے یہ صورت حال پیش آ جائے آپ اسے کیا ہدایات دیتے ہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنے فرائض (سمع و طاعت) ادا کرتے رہنا اور اپنے حقوق کا سوال اللہ سے کرنا (یعنی دعا کرنا)۔'' [مسلم : ۱۸۴۳]

سیدنا وائل حضرمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا سلمہ بن یزید جعفی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ''اے اللہ کے نبی! اگر ایسے حکمران ہم پر مسلط ہو جائیں جو اپنا حق تو ہم سے طلب کریں مگر ہمیں ہمارے حق سے محروم کریں، تو (ایسی صورت میں) آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (سوال کو) نظر انداز فرمایا، اس نے پھر (یہی سوال) کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر نظر انداز فرمایا، حتیٰ کہ اس نے تیسری بار یہی دریافت کیا تو اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ نے اسے (خاموش کرنے کے لیے) کھینچا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] سمع و طاعت، یعنی حکمران کے قانون اور احکام کو سن کر ان کی تعمیل کرنا۔

نے ارشاد فرمایا: ''تم (حکام کا حکم) سنو اور (اس حکم کی) تعمیل کرو، کیونکہ وہ (حکمران) اپنے فرائض (کی ادائیگی) کے ذمہ دار ہیں اور تم اپنے فرائض (کی ادائیگی) کے ذمہ دار ہو۔'' [مسلم: ۱۸٤٦]

⑦ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہم (اہل عرب) برے حال (کفر و جاہلیت) میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے (اپنے فضل و کرم سے) ہمیں خیر (ایمان) سے ہم کنار فرمایا، جس میں اب ہم ہیں۔ تو کیا اس (موجودہ) خیر کے بعد کسی شر کا امکان ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں۔'' میں نے عرض کیا: ''کیا پھر اس شر (برائی) کے بعد (دوبارہ) خیر ہوگی۔'' فرمایا: ''ہاں۔'' میں نے پھر پوچھا: ''کیا اس خیر کے بعد پھر شر ہوگا؟'' فرمایا: ''ہاں۔'' میں نے کہا: ''وہ کیسے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے بعد ایسے حکمران آئیں گے جو میری راہ (ہدایت و سنت) پر نہیں چلیں گے اور نہ ہی میرا طریقہ اختیار کریں گے اور ان میں کچھ ایسے اشخاص بھی ہوں گے کہ جن کے انسانی اجسام میں شیطانوں کے دل ہوں گے (یعنی بظاہر انسان مگر باطن شیاطین کی طرح ہوں گے)۔''

(سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے) پوچھا: ''اگر مجھے ایسے حالات سے واسطہ پڑ جائے تو کیا کروں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو حاکم وقت کی سمع و طاعت کرنا خواہ وہ تیری پیٹھ (کوڑے سے) مارے اور تیرا مال چھین لے۔ پھر بھی سمع و طاعت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔'' [مسلم: ۶۲/ ۱۸٤٧]

⑧ نافع رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ یزید بن معاویہ کے دور حکومت میں جب حرّہ[1] کے واقعے میں جو ہوا سو ہوا تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عبداللہ بن مطیع (باغیوں کے سرغنہ) کے پاس تشریف لائے۔ اس (ابن مطیع) نے کہا ابو عبدالرحمٰن (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) کی

[1] کربلا میں شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد یزید کے اقتدار کے خلاف اہل مدینہ کی بغاوت کے نتیجے میں حرّہ کا سانحہ پیش آیا، جس میں بغاوت کچل دی گئی اور مدینہ منورہ میں بے تحاشا خون ریزی ہوئی۔

کنیت تھی) کے لیے تکیہ لگاؤ (انھیں عزت واکرام سے بٹھاؤ)۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا بلکہ صرف ایک حدیث سنانے آیا ہوں جو میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص (حکمران کی) اطاعت سے دست کش ہوگا، وہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے سامنے اس حال میں پیش ہوگا کہ اس کے پاس (اپنے جرم بغاوت کے دفاع میں) کوئی دلیل نہیں ہوگی اور جو اس حال میں مر گیا کہ وہ بیعت (حکمران کی سمع و طاعت) کا پابند نہ تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

[مسلم : ۱۸۵۱]

ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آئندہ کچھ ایسے حکمران ہوں گے جن کے کچھ کام بھلائی اور کچھ برائی کے ہوں گے، جس نے (ان کی بھلائی کو) اچھا کہا تو وہ بھی بری الذمہ ہوگیا اور جس نے (ان کی برائی کو) برا کہا وہ بھی (خاموش رہنے کے جرم سے) بچ گیا، لیکن جس نے (ان کی برائی کو) پسند کیا اور (برائی میں) پیروی کی (تو وہ اللہ کے ہاں مجرم ہوگا)۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے (یہ سن کر) کہا: ''کیا ہم ان (حکمرانوں) سے جنگ نہ کریں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں۔ (یعنی اس وقت تک ان کے خلاف بغاوت نہ کرنا)۔'' [مسلم : ۱۸۵٤]

سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمھارے بہترین حکمران وہ ہیں کہ تم ان سے اور وہ تم سے محبت کرتے ہوں اور وہ تمھارے لیے اور تم ان کے لیے دعائیں کرو اور تمھارے بدترین حکمران وہ ہوں گے کہ تم ان سے اور وہ تم سے نفرت کریں گے اور تم ان پر اور وہ تم پر لعنت بھیجیں گے۔'' اس پر کسی نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! ہم ان کے خلاف کھلی جنگ نہ کریں؟'' آپ نے فرمایا: ''نہیں، جب تک وہ تم میں نماز قائم رکھیں اور جب تم اپنے حکمرانوں میں کوئی

(شرعی) ناپسندیدہ چیز دیکھو تو ان کے عمل کو برا جانو، لیکن (ان کی) اطاعت سے دست کش نہ ہونا۔" [مسلم: ١٨٥٥]

اس موضوع پر اور بھی بہت سی روایات موجود ہیں، طوالت کے خوف سے انھی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔



فصل سوم

خوارج کی تعریف

امام بربہاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
''جو کسی مسلمان حکمران کے خلاف بغاوت کرے وہ خارجی ہے، ایسے شخص نے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا اور احادیث کی مخالفت کی اور اس کی موت جاہلیت کی ہوگی۔'' [شرح السنة للبربهاري: ۱/ ۲۹]

امام آجری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
''خوارج ناپاک اور پلید قوم ہے، جو زمانہ قدیم وجدید میں پیدا ہوتی رہی ہے۔ یہ لوگ حکام وسلاطین کے خلاف بغاوت اور اہل اسلام کا خون بہانا جائز سمجھتے ہیں۔'' [الشريعة للآجري: ۱/ ٤١]

امام شہرستانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
''ہر وہ شخص خارجی کہلاتا ہے جو مسلمانوں کے متفقہ حکمران کے خلاف بغاوت کرے، خواہ ایسی بغاوت عہد صحابہ میں نیک و پاک باز حکمرانوں کے خلاف ہوئی ہو، یا دورِ تابعین میں ہو، یا کسی بھی زمانے کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف ہو۔''
[الملل والنحل: ۱/ ۱۱۳]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
''خوارج وہ لوگ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کو کافر قرار دیا، یہ لوگ گناہوں کے سبب کسی کو کافر کہتے ہیں اور (اسی طرح) اس شخص کو بھی کافر

کہتے ہیں جو ان کی بدعت (عقیدۂ تکفیر) کی مخالفت کرے اور (اس بنا پر) وہ اس کی جان (لینا) اور مال (لوٹنا) جائز قرار دیتے ہیں۔"

[مجموع الفتاوی : ۳/ ۲۷۹]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

"سب سے پہلے انھی نے اہل قبلہ (اہل اسلام) کو معصیت کے سبب کافر قرار دیا، بلکہ ایسے عمل کے سبب بھی جسے بزعم خود وہ معصیت سمجھتے ہیں (حالانکہ وہ معصیت ہے ہی نہیں) اور اس (تکفیر) کو دلیل بنا کر اہل اسلام کا خون بہانا جائز قرار دے دیا۔" [مجموع الفتاوی : ۷/ ۴۸۱]

مزید فرماتے ہیں:

"ان (خوارج) کی دو خصوصیات ایسی ہیں جن کی بنا پر یہ مسلمانوں اور ان کے حکام سے جدا ہو جاتے ہیں۔"

① ان کا سنت نبوی سے ہٹ کر کسی ایسے فعل کو برائی قرار دینا جو اصل میں برائی ہے ہی نہیں، یا کسی ایسی چیز کو اچھائی قرار دے دینا جو اچھائی ہے ہی نہیں اور یہی وہ خصلت ہے جس کا اظہار (خوارج کے جد امجد) ذوالخویصرہ تمیمی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ کہتے ہوئے کیا تھا: "اے محمد! انصاف کرو، تم نے انصاف نہیں کیا۔" یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: "تیرا ناس ہو جائے، اگر میں ہی انصاف نہ کروں تو اور کون کرے گا، اگر میں بے انصافی کرنے لگ جاؤں تو ناکام و نامراد ہو جاؤں گا۔"

② یہ (خوارج) اہل اسلام کی محض گناہوں کی بنا پر تکفیر کرتے ہیں اور پھر اس (مزعومہ) کفر کے سبب ان کا خون بہانا اور مال لوٹنا روا قرار دے لیتے ہیں۔ اہل اسلام کے ملک کو دار الحرب [1] اور اپنے ملک کو دار الاسلام [2] کا نام دیتے ہیں۔

[مجموع الفتاوی: ۱۹/ ۷۲]

---

[1] دار الحرب: کفار کا ایسا ملک جہاں کے باشندوں سے اہل اسلام حالت جنگ میں ہوں۔

[2] دار الاسلام: اہل اسلام کا ملک جہاں اسلامی شریعت کے مطابق حکومت قائم ہو۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''خوارج وہ لوگ ہیں جنھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر بوجہ تحکیم [1] اعتراض کیا اور سیدنا علی و عثمان رضی اللہ عنہما سے علیحدگی و بیزاری کا اظہار کیا اور ان سے جنگ کی۔ ان میں سے زیادہ متشدد و انتہا پسند وہ خوارج ہیں جنھوں نے انھیں (سیدنا علی و عثمان رضی اللہ عنہما کو) کافر بھی قرار دیا۔'' [هدي الساري: ٤٥٩]

ابن حجر رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

''خوارج وہ قوم ہے جنھوں نے اہل اسلام اور مسلمان حکمرانوں کے خلاف جنگ اور بغاوت کی بدعت ایجاد کی، اسی وجہ سے ان کا نام خوارج (بغاوت کرنے اور اسلام سے نکلنے والے) رکھا گیا۔'' [فتح الباري: ١٢/٤٩٦]

علمائے کرام کے اس سارے کلام کا خلاصہ یہ ہے، ''تمام قسم کے خوارج حکمرانوں کے [خ]لاف بغاوت (خروج) کا عقیدہ رکھنے کی وجہ سے اس (خوارج کے) نام سے موسوم ہوئے۔''

فی الحقیقت خوارج کی دو اقسام ہیں:

پہلی قسم ان خوارج کی ہے جو اپنے فاسد نظریے کی بنا پر (بسببِ معصیت یا بدعت) [ح]کمرانوں کو کافر قرار دے کر ان کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ انھی کے بارے میں [ح]دیث میں آیا ہے کہ ''وہ دین سے یوں نکل جائیں گے جیسے تیر اپنے ہدف سے۔'' یہی وہ [گ]روہ ہے جس کی شدید مذمت حدیث میں آئی ہے اور جنھیں بدترین مخلوق، جہنم کے کتے [ا]ور واجب القتل قرار دیا گیا ہے۔

دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو عقیدۂ تکفیر کے بغیر محض ہوسِ اقتدار میں حکمرانوں کے خلاف اعلانِ بغاوت کرتے ہیں، انھیں صرف باغی کہا جائے گا۔ ان کی بھی دو اقسام ہیں:

---

[1] تحکیم، یعنی جب جنگ صفین کے موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے صلح کے لیے دو ثالثوں کے ذریعے فیصلہ کروانا چاہا تو خوارج نے اس عمل کو شرک و کفر قرار دے کر علیحدگی اختیار کر لی۔

① جو محض حصول اقتدار کے لیے بغاوت کرتے ہیں۔
② جو (غیرتِ) دین کی خاطر اور برائی کے خاتمے کے لیے علم بغاوت بلند کرتے ہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ گروہ بھی دو اعتبار سے خطا کا شکار ہوا ہے، یعنی وہ لوگ جن کی بغاوت معاشرتی برائیوں کی روک تھام کی غرض سے ہوتی ہے۔

① جن کی رائے اور نقطہ نظر دینی اعتبار سے غلط ہوتا ہے، جبکہ وہ اسے عین دین سمجھ رہے ہوتے ہیں، جیسا کہ خوارج اور دیگر خواہش پرست لوگ، جو اپنی خود ساختہ فکرِ خطا کو نہ صرف دین قرار دیتے ہیں بلکہ اس کی خاطر دوسروں سے لڑنے، مرنے اور ان (نہ ماننے والوں) کو کافر ٹھہرانے پر تل جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی نظریاتی لغزش کی بنا پر اپنے مخالفین کی تکفیر، ان سے قتال اور ان پر لعنت و ملامت میں خطا وار متصور ہوں گے۔ اس طرح کے تمام فرقوں میں خوارج سب سے نمایاں ہیں جو اپنے مخالفین بلکہ اپنے ساتھ اتفاق نہ کرنے والوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے میں بہت بے باک ہیں۔

② ایسی قوم جو کتاب وسنت کے خلاف کسی عقیدے یا نظریے کی دعوت دیے بغیر ہتھیار اٹھاتی ہے اور ان کا مطمح نظر کسی خیر یا دینی فائدے کا حصول ہوتا ہے، مگر ایسی مسلح بغاوت سے ان کی مزعومہ بھلائی کا حصول تو در کنار، الٹا عظیم ضرر و فساد بر آمد ہوتا ہے اور مآل کار، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی (خروج و بغاوت سے ممانعت کی) ہدایات کی حکمت و منفعت ان پر واضح ہو جاتی ہے، مگر اس وقت تک تیر کمان سے نکل چکا ہوتا ہے اور تعلیم نبوی سے روگردانی کا بھیانک نتیجہ، امت مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے اور مسلمانوں کا خون بے دریغ بہائے جانے کی صورت میں سامنے آ چکا ہوتا ہے۔ امت کی خیر خواہی اور دینی مصلحت کی نیت سے مسلح تحریکیں برپا کرنے والے ایسے ''خیر خواہانِ ملت'' کو یا تو اس موضوع پر ارشاداتِ نبوی کی خبر ہی نہیں ہوتی، یا وہ (ارشادات) ان کے نزدیک ثابت شدہ نہیں ہوتے یا وہ انھیں منسوخ گمان کرتے

ہیں، جیسا کہ امام ابن حزم کا خیال ہے یا ان میں سے کچھ لوگ ان (ارشادات) کی تاویل کر کے ان سے راہِ فرار تلاش کر لیتے ہیں۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ (خوارج) لوگ دو قسم کے ہیں:

1. جن کا ذکر پہلے آ چکا، یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے والے اور ان کی باقیات، فرقۂ ازارقہ [1] وغیرہ۔
2. وہ باغی لوگ جنھوں نے صرف حصولِ اقتدار کے لیے ہتھیار اٹھائے اور ان کے پیشِ نظر کوئی نظریہ یا عقیدہ نہ تھا۔ ان کی بھی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو حکمرانوں کے ظلم و جور اور ترکِ سنت کے سبب محض غیرت دینی کی بنا پر بغاوت کرتے ہیں۔ یہ لوگ اہل حق ہیں، ان میں بطورِ مثال سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہ، واقعہ حرہ میں شریک ہونے والے اہل مدینہ اور وہ قراء شامل ہیں جنھوں نے حجاج کے خلاف اعلانِ بغاوت کیا تھا۔

دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو صرف اور صرف اقتدار کے لیے بغاوت کرتے ہیں۔ ان کو صرف باغی کا نام دیا جائے گا۔ تاہم دونوں میں قدرِ مشترک (یعنی حکمرانوں کے خلاف بغاوت) کی بنا پر انھیں خوارج ہی کا نام دیا جائے گا۔ اگرچہ دوسری قسم (صرف باغی) قباحت اور مذمت میں پہلی قسم سے کم تر ہے، مگر چونکہ انھوں نے ان احادیث نبویہ پر عمل نہیں کیا جن میں مسلم حکام کے ظلم پر صبر کرنے اور ان کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچنے کا حکم آیا ہے۔ لہٰذا بعض علمائے سلف کے نزدیک ایسے گروہ کو بھی بدعتی گردانا جائے گا۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو شخص یا گروہ کسی ایسے حکمران کے خلاف بغاوت کرے کہ جس کی حکومت پر اہل اسلام کا ان کی رضا مندی یا (ان پر) جبر وقوت سے اتفاق ہو چکا تھا تو ایسا

---

1. ازارقہ فرقہ کا بانی: نافع بن الازرق بن قیس الحنفی البکری الوائلی ہے۔

باغی گروہ مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے والا شمار کیا جائے گا اور اگر وہ اسی حالت (بغاوت) میں مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی۔ مسلمان حکمران سے (باغیانہ) قتال جائز نہیں، نہ ہی اس کے خلاف کسی قسم کی بغاوت جائز ہے، جو ایسا کرے گا وہ بدعتی اور سنت نبوی کا تارک ہو گا۔''

[شرح أصول الاعتقاد للإمام اللالكائي (اعتقاد أحمد بن حنبل : ٢٨١)]

امام بربہاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جس نے بھی مسلمان حکمرانوں میں سے کسی ایک کے خلاف بغاوت کی وہ خارجی ہے اور اس نے اہل اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کیا اور تعلیماتِ سنت کی مخالفت کی اور اس کی موت، جاہلیت کی موت ہو گی۔'' [شرح السنة : ٧٦]

شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''خوارج کا یہی دین و مذہب ہے کہ حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرنا اور محض ان کے فسق و معصیت کی بنا پر ان کی سمع و طاعت ترک کر دینا۔''

[الفتاوى الشرعية في القضايا العصرية : ١٤]

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بعض نادان لوگوں کا یہ کہنا کہ ہم پر حکمرانوں کی سمع و طاعت صرف اس صورت میں واجب ہے کہ وہ (حکمران) مکمل استقامت (دین پر چلنے) کا مظاہرہ کریں، بالکل غلط اور نا درست بات ہے اور شریعت کے میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں ہے، بلکہ یہ تو خوارج کا مذہب ہے جو حکمرانوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں حکم الٰہی پر قائم رہیں، ایسا (عمل) کسی زمانے میں نہیں ہو سکا اور (اب تو) معاملات مزید بدل چکے ہیں۔''

[شرح رياض الصالحين : ٩٧/٤]

اب تک کی بحث سے واضح ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت کے سبب، حکام کے خلاف بغاوت کرنا خوارج کا طریقہ ہے، کیونکہ انھوں نے سب سے پہلے اس روایت کی بنیاد رکھی، اگرچہ بعض خوارج معصیت کی بنا پر مسلمانوں کی تکفیر نہیں کرتے، مگر محض اس (عدم تکفیر کی) وجہ سے انھیں مذمت سے بری نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ بہر حال وہ آثارِ نبویہ کی مخالفت کرنے کے مجرم تو ہیں اور نبی ﷺ کا یہ فیصلہ دوٹوک ہے کہ حالت بغاوت میں مرنے والا جاہلیت کی موت مرتا ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اکثر علماء اس بات کے قائل ہیں کہ ظالم حکمران کی اطاعت پر صبر کرنا، اس کے خلاف بغاوت سے کہیں بہتر ہے، کیونکہ اس سے قوت آزمائی اور بغاوت میں امن و امان کے بجائے خوف و دہشت، خون ریزی، نادان لوگوں کی دست اندازی، اہل اسلام پر غارت گری اور زمین میں فساد کا دور دورہ ہوگا۔"

[تفسير القرطبي : ٢/١٠٩]

بغاوت کے ساتھ اگر نظریہ وعقیدہ بھی یہ ہو کہ ہمارا یہ عمل (بغاوت) دینی تقاضا ہے تو اس پر شریعت میں شدید مذمت آئی ہے، تاہم اس نظریے کے بغیر محض حصولِ اقتدار کے لیے علم بغاوت بلند کرنا، ایک علیحدہ عمل ہے اور اس کا شرعی حکم اور دنیاوی سزا بھی مقرر ہے۔

خوارج مارقہ [1] کے کفر کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ان (خوارج) کا عدم کفر ہی مشہور ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتب میں متعدد بار اس کا ذکر کیا ہے، مگر باغیوں کا معاملہ اور ہے۔ دراصل دونوں میں اس بات کا واضح فرق ہے کہ دونوں علیحدہ علیحدہ اغراض و مقاصد کی خاطر قتال کرتے ہیں۔ خوارج مارقہ کی سرکوبی اس لیے کی جائے گی کہ وہ دین سے نکل جانے اور مسلمانوں کے خلاف سرکشی اور بغاوت کے مجرم ہیں، جبکہ باغیوں کو اس لیے کچلا جائے گا کہ وہ حکام وقت

---

[1] مارقہ، یعنی دین سے نکل جانے والے۔

کے خلاف بغاوت کرنے پر قصوروار ہیں۔ غرضیکہ دونوں گروہوں کی حقیقت میں فرق ہے اور دونوں کے خلاف احکام شریعت جدا جدا ہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''شریعت نے خوارج مارقہ کے خلاف قتال کا حکم محض اس لیے نہیں دیا کہ وہ اہل اسلام پر ہتھیار اٹھاتے اور بغاوت کا ارتکاب کرتے ہیں، جیسا کہ ڈاکوؤں یا راہ زنوں کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے کہ حکام اپنی طاقت کے ذریعے ایسے عناصر کی بیخ کنی کر دیتے ہیں، کیونکہ ایسے عناصر کے خلاف قوت کا استعمال صرف اس وقت تک ہوگا جب تک ان کا زور ٹوٹ نہ جائے اور وہ اپنی مجرمانہ روش چھوڑ کر قانون کی اطاعت میں داخل نہ ہو جائیں اور ان مجرمین کو اس طرح بھی نہیں مارا جائے گا کہ جہاں ملیں وہیں قتل کر دیے جائیں اور نہ ہی انھیں قوم عاد کی طرح ہلاک کیا جائے گا اور نہ ہی انھیں روئے زمین پر سب سے بدتر مخلوق گردانا جائے گا، بلکہ آخری چارۂ کار کے طور پر ان کے خلاف قانون اپنی طاقت کا حربہ استعمال کرے گا، جبکہ خوارج مارقہ کا حال ہی بالکل مختلف ہے، انھیں اس بنا پر مارا جائے گا کہ یہ دین سے خارج ہو چکے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''وہ (خوارج) دین سے یوں نکل جائیں گے جیسے تیر اپنے ہدف سے نکل جاتا ہے (یہ لوگ) تمھیں جہاں کہیں ملیں وہیں انھیں مار ڈالو۔'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں قتل کرنے کا حکم ان کے (دین سے) نکل جانے کے سبب دیا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ خوارجِ مارقہ کا یہی (دین سے نکل جانا ہی) جرم ہے کہ جس پر شریعت اسلام میں ان کی سزا قتل رکھی گئی ہے۔ محض بغاوت کرنے یا حکامِ اسلام کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی پاداش میں ایسی سخت سزا نہیں مقرر کی گئی۔ عام باغیوں اور خوارج کے درمیان شریعت میں یہ فرق بھی ہے کہ عام باغیوں کو اصلاح و توبہ کی مہلت اور معافی بھی دی جا سکتی ہے، جبکہ خوارج کے لیے قانونِ اسلام میں مہلت یا اصلاحِ احوال کا کوئی ضابطہ و قانون نہیں ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اس فعل سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو کہ انھوں نے خوارج سے لڑنے میں تاخیر کی تھی۔ اس (تاخیر) کی وجہ

...ف یہ تھی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو شروع میں پتا نہ چل سکا کہ یہ لوگ وہی ہیں جن کا احادیث میں بطور خوارج تذکرہ آیا ہے، حتیٰ کہ جب ان (خارجی) لوگوں نے ابن خباب رضی اللہ عنہ کو ...ح کر ڈالا اور لوٹ مار مچائی تو آپ رضی اللہ عنہ کو واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ یہ گروہ وہی (خارجی گروہ) ہے۔ چنانچہ آپ نے ان کی خوب سرکوبی کی اور اچھی طرح ان کا فتنہ ختم ...یا۔" [الصارم المسلول: ۲/۳۴۷]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تاتاریوں سے قتال پر ابھارتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ لوگ یعنی تاتاری محقق علماء کے نزدیک مسلمان حکام کے باغیوں کی حیثیت نہیں رکھتے، جیسے اہل شام نے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے خلاف (بغاوت کا) رویہ رکھا تھا، وہ (اہل شام) تو درحقیقت ایک امام معین کے باغی تھے، جو ان (علی رضی اللہ عنہ) کی حکومت کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے، جبکہ یہ مذکورہ قوم (تاتاری) تو دراصل خارج از اسلام لوگ ہیں، جیسے مانعین زکوٰۃ اور وہ خوارج جن سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے قتال کیا تھا۔ اسی لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا سلوک ہمیں جدا جدا نظر آتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اہل شام (سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں) کے ساتھ قتال میں بھی اسلامی اخوت کو ملحوظ رکھا، جبکہ اہل نہروان (خوارج) سے قتال میں آپ کا سلوک بالکل مختلف تھا۔ مانعین زکوٰۃ کے خلاف سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قتال اور خوارج کے خلاف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے قتال پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق تھا کہ یہ قتال برحق ہے، جبکہ اہل شام اور اہل بصرہ کے خلاف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج کشی کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین کا اختلاف ہے کہ اس قتال میں برحق کون تھا؟'' [مجموع الفتاوی: ۲۸/۵۰۳]

فصل چہارم

اہم مباحث

مبحث اوّل: خوارج کون؟

ہر وہ شخص جو ایسے عمل کے سبب تکفیر کرے کہ جو کفر نہ تھا اور اسی بنا پر بغاوت کو جائز قرار دے دے تو وہی خارجی اور خارج از اسلام ہے، خواہ کبیرہ گناہ کی بنا پر کسی کو کافر قرار نہ دے۔

لہٰذا خروجِ مذموم [1] کا اصول یہ ٹھہرا کہ ''کفر سے کم تر عمل کے سبب کسی کو کافر قرار دینا، پھر اس کے خلاف مسلح بغاوت کرنا اور اہل اسلام کا خون بہانے کو روا رکھنا۔''

یہاں ایک چیز قابلِ توجہ ہے کہ ہم نے مذکورہ بالا عبارت میں ''کفر سے کم تر'' ذکر کیا ہے اور اس عبارت کے مفہوم میں، معصیت کے علاوہ کچھ جائز اور مستحب اعمال بھی شامل ہو جاتے ہیں، جیسے سب سے پہلے خوارج نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو محض اس بنا پر کافر قرار دیا کہ انھوں نے صلح اور مسلمانوں کی باہمی خون ریزی روکنے کے لیے تحکیم (ثالث مقرر کرنا) کی تھی اور یہ تحکیم اس موقع پر یقیناً ایک عمل مستحب تھا کہ اس سے اہل اسلام کا خون بہنا موقوف ہوا اور کبھی یہ مستحب عمل واجب کا درجہ بھی اختیار کر لیتا ہے، جب اس کے سوا خون ریزی روکنے کا کوئی اور طریقہ موجود نہ ہو۔

دوسری بات جو قابل توجہ ہے کہ یہ خوارج بعض دفعہ ایک ہی عمل پر اور کبھی زیادہ اعمال

[1] خروجِ مذموم، یعنی خارجیوں کا قابل مذمت عقیدہ۔

...کر دیتے ہیں، جیسا کہ عموماً ان کی طرف سے کبائر [1] پر تکفیر کی جاتی ہے اور خوارج کے تمام گروہوں کا یہ مشترکہ عقیدہ ہے۔ اس نکتے کو سمجھنا بہت ضروری ہے، کیونکہ بعض لوگ ...سمجھتے ہیں کہ خوارج صرف وہی ہوتے ہیں جو محض کبیرہ گناہوں کے سبب کسی کی تکفیر کریں، مگر یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

خوارج کا ظہور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے تصادم کے وقت ہوا اور اس وقت ...انھوں (خوارج) نے کسی کبیرہ گناہ کے سبب سے نہیں بلکہ صرف تحکیم [2] کی بنا پر علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کی تکفیر کی تھی اور تب ان کے عقائد میں کبائر کی وجہ سے تکفیر کا تصور تک نہ تھا ...اور بلاشبہ وہی گروہ پہلے خوارج تھے۔

ابو بکر ابن العربی رحمہ اللہ حدیثِ خوارج کی شرح میں فرماتے ہیں:

''اس سوال کا جواب کہ خوارج کون ہیں؟ یہ ہے کہ یہ گروہ اہل حروراء [3] اور ان جیسے دیگر عناصر پر مشتمل ہے جو سیدنا علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کے باہمی اختلاف و قتال کے وقت رونما ہوا اور انھی لوگوں کے خوارج ہونے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے عین مطابق اس فرقے کا ظہور اسی طرح ہوا جیسے ان کے متعلق حدیث میں الفاظ آئے ہیں کہ وہ (خوارج) دو گروہوں کے آپس میں افتراق کے وقت ظاہر ہوں گے اور ان کا سرغنہ اہل حق کے ہاتھوں قتل ہو گا، جس کی علامت یہ ہو گی کہ اس کے کٹے ہوئے بازو کا سرا پستان کی بٹنی جیسا ہوگا۔ چنانچہ رسولِ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی حرف بحرف سچ ثابت ہوئی اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے جنگ نہروان میں فتح حاصل کرنے کے بعد اس مقتول کو بطورِ خاص تلاش کروایا۔'' [عارضة الأحوذي : ٩ / ٣٨]

---

[1] کبائر یعنی ایسے اعمالِ بد جو سوائے توبہ یا اخروی سزا کے معاف نہ ہو سکیں۔
[2] تحکیم، یعنی وہ ثالثی اور مصالحتی کوشش جو جنگ صفین کے موقع پر سیدنا علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان ہوئی۔
[3] اہل حروراء، حروراء نامی بستی، خوارج کا مرکز تھی، اس نسبت سے انھیں اہل حروراء یا حروری کہا جاتا تھا۔

مختصراً یہ ثابت ہوا کہ احادیث میں بیان ہونے والی مذمت ہر اس خارجی پر صادق آتی ہے جو کسی کے ایک یا زیادہ عمل کی بنیاد پر اپنی جہالت اور نادانی کے سبب کفر کا فتویٰ لگائے اور پھر اس (اپنے مزعومہ کافر) سے قتال کرنے اور اس کا خون بہانے کو جائز قرار دے۔ رہی یہ بات کہ کبائر کے سبب تکفیر کرنا، تو یہ تشدد بعد میں آنے والے خوارج نے شروع کیا جو سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے دور میں ظاہر ہوئے تھے۔

امام ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خوارج اپنی اصل کے اعتبار سے دو اقسام پر مشتمل ہیں:

① وہ خوارج جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سیدنا عثمان، علی رضی اللہ عنہما اور اصحابِ جمل [1] اور تحکیم کو ماننے والے، سب کافر ہیں۔

② وہ خوارج جن کا عقیدہ ہے کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جو کوئی بھی کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو وہ دائمی و ابدی جہنمی ہے۔ [عارضة الأحوذي : ٩ / ٣٨]

شیخ عبداللطیف آل شیخ فرماتے ہیں:

"یہ (مذکورہ بالا) ان (خوارج) کے دین و عقیدہ کا خلاصہ ہے اور آپ نے ان کے وہ شبہات و دلائل بھی جان لیے جن کی بنا پر انھوں نے سیدنا علی و معاویہ رضی اللہ عنہما اور ان کے ساتھیوں کی تکفیر کی تھی۔ اس واقعہ (تحکیم) کے بعد ان کا یہ عقیدۂ تکفیر ان کے متفرق گروہوں میں چلتا رہا اور ان میں سے غلو کرنے والوں نے محض کبائر کے سبب بھی تکفیر شروع کر دی۔ پھر انھیں حکومت اور شان و شوکت بھی حاصل ہوگئی۔ چنانچہ ان کی سرکوبی کے لیے مہلب بن ابی صفرہ، حجاج بن یوسف اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما وغیرہم نے ان سے مختلف اوقات میں قتال کیا۔ بعد میں ان کے بارے یہ مشہور ہو گیا کہ یہ لوگ شرک سے کم تر درجے کے گناہ کے

---

[1] اصحابِ جمل، یعنی جنگ جمل میں شامل ہونے والے فریقین کے افراد، جن میں خود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔

کے سبب بھی تکفیر کر دیتے ہیں۔" [الدرر السنية : ٩/٢٢٩]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"خوارج وہ گروہ ہے جنھوں نے تحکیم کی وجہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو برا جانا اور ان (علی رضی اللہ عنہ) سے اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے براءت اور لاتعلقی کا اعلان کیا اور ان سے جنگ کی اور ان میں سے غالی گروہ وہ ہے جو محض گناہ کے سبب مسلمانوں کی تکفیر کر دیتا ہے۔ [هدي الساري مقدمه فتح الباري : ٤٥٩]

اگرچہ احادیث میں ان کی بعض علامات اور مذمت تو آئی ہے مگر اس امر کا ذکر نہیں آیا کہ وہ صرف کبائر کے سبب تکفیر کیا کریں گے، البتہ مذکورہ نشانیاں ذکر کی گئیں ہیں:

① اہل اسلام کو قتل کریں گے مگر اہل اوثان (بت پرستوں) سے کچھ تعرض نہیں کریں گے۔

② قرآن تو پڑھیں گے مگر وہ (اپنی تاثیر کے ساتھ) ان کے حلقوں سے نیچے نہیں اتر پائے گا۔

③ وہ ایسے لوگ ہوں گے جو بات تو بہت خوش نما کہیں گے مگر ان کے افعال بہت برے ہوں گے۔

جب ہم ان کے اقوال و افعال کو بغور دیکھتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ یہ لوگ ائمہ دین اور علمائے امت کو برا کہتے اور مطعون کرتے ہیں اور قرآن کریم کی ناحق تفسیر کرتے ہیں اور معمولی گناہ کے باعث تکفیر کر دیتے ہیں اور اسی تکفیر کے نتیجے میں اہل اسلام کے خون، ان کی عصمتوں اور اموال کو پامال کرتے ہوئے ہتھیار اٹھا لیتے ہیں، ان کے اس طرز عمل سے یہ پتا چلا کہ ان جیسا عقیدہ و طرز عمل اختیار کرنے والا ہر شخص خارجی کہلائے گا اور حدیث میں آنے والی وعید و مذمت کا مصداق ٹھہرے گا۔

امام شاطبی رحمہ اللہ خوارج کے ذکر کے تحت لکھتے ہیں:

''احادیث میں آنے والی علاماتِ خوارج سب سے زیادہ مہدی مغربی [1] اور اس کی جماعت پر صادق آتی ہیں، کیونکہ ان میں یہ دو خصلتیں نمایاں تھیں جن کی بابت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''وہ قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلقوں سے آگے نہ گزر پائے گا اور وہ اہل اسلام کو تہ تیغ کریں گے جبکہ بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے۔'' [الاعتصام للشاطبي : ٦٢٦/٢]

علمائے سلف میں سے بعض نے اسی بنا پر خوارج کو اہل بدعت کا نام دیا ہے، کیونکہ عقیدۂ خوارج بھی بہرحال ایک بدعتی عقیدہ ہے اور تمام اہل بدعت شریعت سے تجاوز کرنے کی خصلت میں باہم مشترک ہیں۔

امام شاطبی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں کہ کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ احادیث میں آنے والی مذمت و وعید تو خاص طور پر انھی لوگوں کے متعلق تھی جو ابتدا میں اس فاسد عقیدے کے بانی تھے اور دیگر گروہوں پر اس کا انطباق نہیں ہوتا، بلکہ ہر وہ فرد یا گروہ جو اسی طرح کے فکر و عمل اور رویے کا حامل ہوگا وہ اصولی اعتبار سے انھی میں شمار ہوگا اور تمام خارجی فرقے ہر کبیرہ گناہ کے سبب تکفیر کرنے پر متفق بھی نہیں بلکہ ان میں سے کئی گروہ ایسے ہیں جو کبائر کی وجہ سے تکفیر نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود وہ خوارج کے سرکردہ اور نمایاں فرقوں میں سے ہیں۔

ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''خوارج کے تمام فرقے اس عقیدے پر متفق ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے تحکیم کے سبب کفر کا ارتکاب کیا مگر اس کے بعد وہ اس بات میں اختلاف کرتے ہیں کہ ان (علی رضی اللہ عنہ) کا کفر، شرک بھی تھا یا نہیں؟ اور وہ آپس میں اس بات پر متفق ہیں کہ

---

[1] مہدی مغربی کا نام نجدہ بن عامر حنفی تھا جس نے ۶۵ھ میں خروج کا فتنہ برپا کیا اور جنگ یمامہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ لڑائی کی، پھر خلافت عبدالملک بن مروان میں اس کا قصہ تمام کر دیا گیا۔

ہر کبیرہ گناہ کفر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کبیرہ گناہ کے مرتکب کو دائمی عذاب دے گا سوائے اہل نجدہ کے، وہ کبائر کے مرتکب شخص کے دائمی جہنمی ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتے۔'' [مقالات الإسلاميين : ١/١٧٠]

مبحث دوم: اہل عہد اور ذمیوں کے خون کا حلال جاننا:

خوارج نے جہاں بہت سے مسائل میں اہل سنت کی مخالفت کی ہے وہیں انھوں نے اہل عہد [1] اور اہل ذمہ کے قتل کو بھی روا رکھنے کا عقیدہ اختیار کیا ہے۔ امام شہرستانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ جس نے بھی معاہدین اور مستامنین [2] کا قتل روا رکھا، اس نے خوارج کا مسلک اختیار کیا، کیونکہ اس نے انھیں (معاہدین کو) اہل اسلام کے دیے ہوئے عہد، امن اور حفظِ جان و مال کا پاس نہیں کیا اور یہ طرزِ عمل سنت رسول ﷺ کے خلاف ہے اور اس امر پر امت کا اتفاق ہے۔'' [كشف الشبهات في مسائل العهد والجهاد]

مبحث سوم: فاسق مسلم حکمران کے خلاف بغاوت جائز نہیں:

اس بارے بکثرت احادیث موجود ہیں اور امت کا اس پر اتفاق بھی ہے۔ اب تک کی جانے والی بحث سے یہ بات بخوبی ثابت ہو چکی ہے کہ ظالم اور فاسق حکمران کے خلاف ہتھیار اٹھانا شریعت اسلامیہ میں جائز نہیں، بشرطیکہ اس کا کوئی عمل حدِ کفر کو نہ پہنچ جائے اور وہ کفر ایسا واضح ہو کہ مسلمانوں کو اس میں کوئی شک باقی نہ رہے اور یہ مسئلہ اہل السنۃ کے ہاں بنیادی عقائد میں سے ہے اور تمام اہل بدعت، خصوصاً خوارج نے اس میں اہل سنت

---

[1] اہل عہد، ایسے کفار کو کہا جاتا ہے جو اسلامی حکومت کی اجازت سے دارالاسلام میں عارضی طور پر اقامت اختیار کرتے ہیں اور اہل ذمہ (ذمی) ان کفار کو کہا جاتا ہے جو مستقلاً دارالاسلام کے شہری بن جائیں اور ایک مخصوص معاہدے کے ساتھ انھیں جان، مال، عزت اور مذہب کا تحفظ دیا جائے۔

[2] مستامنین، ایسے کفار جو کسی سبب سے لاچار ہو کر دارالاسلام میں پناہ حاصل کریں۔

کی مخالفت کی ہے، عقیدے کی کوئی چھوٹی بڑی کتاب اس کے بیان سے خالی نہیں ہے۔

ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''احادیث میں صاف طور پر اس بات کی دلیل موجود ہے کہ ظالم حکام کے خلاف بغاوت جائز نہیں، بلکہ ان کی سمع و طاعت لازم ہے۔ فقہاء بھی اس امر پر متفق ہیں کہ مقتدر حکمران کی اطاعت واجب ہے، جب تک وہ نماز کو قائم رکھیں اور ان کی معیت میں جہاد بھی درست ہے، کیونکہ ظلم کے خاتمے کی نیت سے کی جانے والی بغاوت، اس سے بڑے مظالم اور خون ریزی پر منتج ہو گی اور تاریخ اسلام میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ ہاں! البتہ واضح اور علانیہ کفر کے ارتکاب سے بغاوت جائز ہو جاتی ہے، مگر اس میں بھی اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے گا کہ اتنی قوت و استعداد موجود ہو جو بغاوت کو کامیابی سے ہم کنار کر سکے، کیونکہ حدیث میں آپ ﷺ کا فرمان واضح ہے:

«مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ»

[مسلم: ٤٩]

''تم میں سے جو کوئی بھی خلاف دین چیز دیکھے، وہ اسے بزورِ بازو مٹا ڈالے۔ لیکن اگر اسے (مطلوبہ) قوت حاصل نہیں تو (صرف) زبان سے بدل ڈالے۔''

[شرح البخاري لابن بطال: ١٠ / ٨]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ تم حکام کے حقِ حکمرانی کا انکار نہ کرو اور نہ ہی ان کے درپے آزار ہو جاؤ۔ ہاں! اگر تم ان میں کوئی ایسی برائی دیکھو جسے تم اسلامی تعلیمات کی رو سے واضح طور پر برا جانتے ہو تو ایسی صورت میں کلمۂ حق کہتے ہوئے اس کی مخالفت کرو، مگر بغاوت پھر بھی جائز نہیں ہوگی۔ اس پر امت کا اتفاق ہے، خواہ حکام کتنے بھی فاسق و فاجر ہو جائیں۔ اس موضوع پر آنے والی احادیث بالکل واضح ہیں کہ محض فسق و فجور کی بنا پر حکمران کو معزول نہیں کیا جا سکتا اور بعض فقہاء اور معتزلہ سے اس بارے میں جو اختلافی موقف بیان کیا جاتا ہے وہ اجماع و اتفاق کے مخالف اور غیر صحیح

ہے، یہ شروع میں تھا بعد میں بھی اس امر پر متفق ہو گئے کہ حاکم فاسق کے خلاف بغاوت حرام ہے۔ [شرح مسلم للنووی: ۱۲/۴۶۹، ح: ۱۷۰۶]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین فتنے کے دور میں خروج و قتال سے منع فرماتے رہے، جیسا کہ ابن عمر، ابن مسیب اور علی بن حسین رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابہ کرام نے حرہ کی لڑائی میں یزید کے خلاف بغاوت سے منع فرمایا۔ اسی طرح تابعین میں سے حسن بصری اور مجاہد وغیرھما، ابن اشعث [1] کی بغاوت میں شمولیت سے روکتے رہے۔ لہٰذا اہل سنت کا اتفاق ہے کہ فتنہ و فساد کے حالات میں قتال نہ کیا جائے۔'' [منہاج السنة : ۸/۲۹۸]

کیونکہ احادیث صحیحہ اس باب میں بالکل دوٹوک ہیں کہ ظالم حکام کے خلاف خروج و قتال روا نہیں، بلکہ ایسے حالات میں صبر ہی کا حکم دیا گیا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت [2] کا مسلک یہ طے پایا کہ جماعت [3] سے مل کر رہنا، حکام کے خلاف قتال نہ کرنا اور فتنہ و فساد [4] کے دور میں اپنے آپ کو اس سے دور رکھنا ہی اصل فریضہ ہے، تاہم معتزلہ اور ان جیسے اہل ہوا [5] حکام کی بغاوت کو جائز سمجھتے ہیں۔

[مجموع الفتاوی: ۲۸/۱۲۸]

---

1. ابن اشعث بنو امیہ ہی کا نامور جرنیل تھا جس نے حجاج کے کسی سخت حکم پر برہم ہو کر علم بغاوت بلند کیا، مگر شروع میں کئی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد آخر کار شکست سے دوچار ہوا اور اس نے خودکشی کر لی اور اس کے ہزاروں ساتھی گرفتار کر کے قتل کیے گئے۔
2. اہل السنة والجماعة، اصطلاح میں اس گروہ کو کہتے ہیں جو اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور طریق صحابہ رضی اللہ عنہم پر قائم رہیں گے اور تا قیامت ان کا وجود مسعود باقی رہے گا۔
3. جماعت سے مراد اہل اسلام کی اکثریت اور ان کا اکٹھ ہے۔
4. فتنہ و فساد سے مراد ایسے حالات ہیں کہ جن میں اختلاف و نزاع اور اہل اسلام کا باہمی جنگ و جدال ہو اور حق و ناحق کی پہچان مشکل ہو جائے۔
5. اہل ہوا کا لغوی معنی ہے خواہشات کے پیروکار، اصطلاح میں ایسے لوگ اور گروہ مراد ہیں جو کتاب و سنت سے دلیل لے کر چلنے کے بجائے محض اپنی رائے اور طبعی میلان کو ترجیح دے کر اپنا عقیدہ و عمل اختیار کریں۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظالم حکام کے خلاف بغاوت کو شروع میں روا رکھا جاتا تھا مگر بعد میں متعدد تجربات و واقعات سے یہ ثابت ہو گیا کہ ظلم وفسق کے خاتمے کے لیے کی جانے والی بغاوت، اس (ظلم وفسق) سے کہیں بڑی خرابی، بدامنی اور خون ریزی پر منتج ہوئی ہے۔ چنانچہ اس نتیجے کی روشنی میں تمام علمائے امت اس امر پر متفق ہو گئے ہیں کہ محض فسق وظلم کی بنا پر کسی حکمران کے خلاف بغاوت جائز نہیں۔

[تهذيب التهذيب : ٢ / ٢٥٠]

مبحثِ چہارم: بعض اہل علم وخیر کا ظالم حکام کے خلاف خروج اور اس سے استدلال کی حقیقت:

ظلم وفسق کی بنا پر بعض اہل علم اور صالحین نے مختلف اوقات میں حکمرانوں کے خلاف جو علم بغاوت بلند کیا، ان کے اس عمل سے استدلال کرنا اور اس پر بنیاد رکھتے ہوئے یہی طرزِ عمل اپنانا قطعاً غلط اور ناروا ہے، جیسا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ، اہل مدینہ،[1] ابن اشعث اور نفس زکیہ[2] وغیرہ کے طرزِ عمل سے غلط فہمی ہوتی ہے، ہم بالترتیب اس کی توجیہ بیان کرتے ہیں:

① اہل السنۃ والجماعۃ کے بنیادی اور کھلے عقائد میں سے ہے کہ کتاب وسنت کے مخالف کسی بھی عمل میں کوئی بھی شخص حجت ودلیل نہیں ہے، خواہ ایسا عمل کرنے والا کوئی بھی ہو۔ ظالم حکمرانوں کے ظلم اور ان کے فسق وفجور اور زیادتی پر صبر کرنا اور بغاوت نہ کرنا، اس کے بارے میں شریعت کے احکام ایسے دوٹوک ہیں کہ کسی کے لیے ان سے بھاگنا ممکن نہیں۔ ان احکام میں سے چند ایک بطور مثال پیش ہیں:

---

1. اہل مدینہ نے یزید کے خلاف بغاوت کی اور واقعہ حرہ میں سخت خون ریزی اور بے حرمتی کے بعد یہ بغاوت کچل دی گئی۔
2. نفس زکیہ، محمد بن عبد اللہ کا لقب ہے اور یہ پانچویں پشت پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے جا ملتے ہیں، بنو امیہ کے اقتدار کے خاتمے کے دنوں میں انھوں نے خلافت علوی قائم کرنے کی غرض سے مسلح جدوجہد کی، مگر بنو عباس نے ان کی اس کوشش کو کچل دیا اور یہ اپنے حامیوں سمیت قتل کر دیے گئے۔

① فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ [النساء : ٥٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔''

② رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میں جب تمھیں کسی چیز سے روک دوں تو رک جایا کرو اور جب کسی کام کا حکم دوں تو حتی المقدور اسے بجا لایا کرو۔'' [بخاري : ٧٢٨٨]

③ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''میرے خیال میں یہ لوگ ہلاک ہو جائیں گے، (کیونکہ) میں انھیں (کسی مسئلے میں) کہتا ہوں کہ آپ ﷺ نے یوں کیا اور یہ کہتے ہیں کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے تو یوں کیا تھا، (یعنی سنت نبوی کے بجائے صحابہ کے عمل کو لازم پکڑتے ہیں)۔''

[مسند أحمد : ١/ ٣٣٧، ح : ٣١٢٠]

④ حج تمتع کے مسئلہ میں گفتگو کے دوران ایک شخص نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: ''آپ کے والد (عمر رضی اللہ عنہ) نے تو اس (حج تمتع) سے منع فرمایا ہے۔'' تو جواب میں ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''یہ بتاؤ کہ اگر میرے والد نے اس سے روکا اور رسول اللہ ﷺ نے وہ کام کر کے دکھایا تو ہم اتباع کس کی کریں گے؟ میرے والد کی یا رسول اللہ ﷺ کی؟'' اس پر وہ آدمی کہنے لگا کہ ہاں! بات تو رسول اللہ ﷺ ہی کی مانی جائے گی۔ تو ابن عمر رضی اللہ عنہما

نے فرمایا: ''سن لو! یہ کام (حج تمتع) رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔'' [ترمذي : ٨٢٤]

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''علمائے امت کا اس پر اتفاق ہے کہ جب کسی مسئلے میں سنت نبوی ﷺ واضح طور پر ثابت ہو جائے تو کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی اور کے کہنے پر اس (سنت) سے روگردانی کرے۔ علماء کے اقوال دلیل نہیں بن سکتے جب تک ان کے لیے شریعت سے دلیل موجود نہ ہو۔'' [إعلام الموقعين : ٢ / ٢٨٢]

تاریخ اسلام میں ظالم حکمرانوں کے خلاف بغاوت میں کچھ اہل علم و دین کی مثال پائی جاتی ہے، اس بارے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

''جنگِ جمل، صفین، حرہ اور جماجم وغیرہ میں لڑنے والے کسی بدعتی عقیدے کی خاطر لڑنے والے نہ تھے، بلکہ ان کے پیش نظر صرف اصلاح و خیر تھی، مگر یہ علیحدہ بات ہے کہ اس قتال کا مطلوبہ نتیجہ نکلنے کے بجائے خرابی اور فساد کئی گنا زیادہ بڑھ گئے اور آخر میں نبی کریم ﷺ کے فرمان (بغاوت کی ممانعت) کی حکمت و مصلحت بالکل واضح ہوگئی کہ ترکِ بغاوت میں ہی فائدہ زیادہ اور نقصان کم تھا۔ بغاوت و قتال کے ان تمام واقعات میں ملوث ہونے والے اہل دین اور اہل علم اس لیے معذور سمجھے جائیں گے کہ ان میں سے کئی کو یہ احادیث نہ مل سکیں یا ان کے نزدیک یہ ثابت شدہ نہ تھیں یا وہ انھیں منسوخ سمجھتے تھے، جیسا کہ امام ابن حزم کا خیال ہے اور کئی ان احادیث کی تاویل کرتے تھے اور یوں وہ معذور قرار پاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان واقعات میں حصہ لینے والوں کے پاس مذکورہ تین وجوہات میں سے کوئی ایک وجہ موجود تھی۔''

[منهاج السنة : ٤/ ٥٣٨]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

''اہل حرہ، مہلب اور ابن اشعث وغیرہ کو اپنی باغیانہ روش سے کچھ نہ حاصل ہوا، نہ دنیا ہی مل پائی اور نہ دین ہی قائم ہو سکا اور اللہ تعالیٰ ایسے کسی کام پر راضی نہیں ہو سکتے جس

سے نہ دنیاوی مفاد ملے اور نہ اخروی فائدہ حاصل ہو سکے۔ خواہ ایسا کام کرنے والا کوئی متقی اور پرہیزگار ولی اللہ ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ بہرحال وہ سیدنا علی، عائشہ، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم سے افضل نہیں ہو سکتا اور ان کے یہ (مبنی بر قتال) اعمال بہرحال قابل ستائش نہیں ہیں، حالانکہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑی قدر و منزلت والے اور نیک نیت ہونے میں دوسروں سے کہیں افضل ہیں۔ اہل حرہ میں علماء اور دین دار لوگوں کی بڑی تعداد شامل تھی، اسی طرح ابن اشعث کے ساتھیوں میں بھی اہل علم و خیر بکثرت موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو معاف فرمائے۔''

[منهاج السنة : ٤/ ٥٢٨]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس بارے میں ایک اہم اصول بیان فرماتے ہیں کہ اس معاملے میں ملوث ہونے والا خواہ کتنا ہی عالم اور متقی ہو، دراصل وہ اپنے ظن اور اجتہاد کی بنیاد پر قتال و خروج کا مرتکب ہوتا ہے اور اس میں کچھ نہ کچھ حصہ اس کی چھپی ہوئی خواہشات کا بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں قطعاً ایسے افراد کی اتباع درست نہیں، خواہ وہ اللہ کا ولی ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے وقت میں فتنہ دو قسم کے گروہ پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔

ایک گروہ جو اپنے قائد (قتال و خروج کے بانی) کی تعظیم کرتے ہوئے اس کے فعل کو برحق جانتا اور اس کی پیروی کو فرض قرار دیتا ہے اور دوسرا گروہ وہ جو اس (قائد خروج) کی مذمت کرتا ہے اور اس کے تقویٰ و طہارت اور اس کے ایمان تک کا انکار کر ڈالتا ہے، یہ دونوں گروہ اور ان کا طرز عمل مبنی بر فساد ہے۔ [منهاج السنة : ٤/ ٥٤٣]

(۴) امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بہت سے ایسے اہل علم و دین نے اپنے باغیانہ فکر و عمل سے رجوع کر کے اپنی اصلاح کر لی جو قتال و خروج کا آغاز کر چکے تھے، یا کرنے والے تھے اور وہ اس پر نادم بھی ہوئے۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ انھوں نے یزید بن معاویہ کے خلاف بغاوت کا ارادہ ترک کر دیا تھا، جب انھیں اہل عراق کی بے وفائی کا پتا چلا اور ان پر واضح ہو گیا کہ اب اس (بغاوت) کے نتائج بھیانک ہوں گے۔''

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

''سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر بھی یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ ترکِ قتال میں کہیں زیادہ فائدہ ہے اور اسی طرح سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بھی مظلومانہ شہید کیے گئے، حالانکہ وہ اقتدار کی کشمکش چھوڑ کر واپس مدینہ لوٹ جانے یا اسلامی سرحدوں پر جہاد میں شریک ہونے یا یزید سے بالمشافہ معاملہ طے کرنے کا ارادہ فرما چکے تھے۔ اگر کوئی کہے کہ سیدنا علی و حسین رضی اللہ عنہما نے اپنے ساتھیوں کی بے وفائی اور بے دست و پا ہونے پر مجبوراً صلح اور ترکِ قتال کی راہ اختیار کی تھی اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ سوائے خون ریزی اور فساد کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تو جواب میں یہ کہا جائے گا کہ بعینہٖ یہی حکمت و مصلحت ہے جس کی خاطر شریعت نے ایسے اقدامات سے منع فرمایا ہے، حالانکہ ایسا کرنے والوں کے پیش نظر برائی کا قلع قمع کرنا اور بھلائی کو فروغ دینا ہوتا ہے، جیسا کہ واقعۂ حرہ اور جماجم میں بغاوت کرنے والوں کا مقصود بھی یہی تھا، مگر نتیجہ ان کے مقصود کے برعکس نکلا اور ان کی مزعومہ بھلائی سے کہیں بڑی برائی عصمتوں کی پامالی، خون ریزی اور شہروں کے تاراج ہونے کی صورت میں برآمد ہوئی۔ اسی بنا پر مشہور فقہی اصول قائم کیا گیا کہ کسی برائی کو اس سے بڑی برائی کا ارتکاب کر کے دور نہیں کیا جا سکتا اور اسی طرح کسی بھلائی کے حصول کی خاطر ایسا کام نہیں کیا جا سکتا جس میں ایسی برائی چھپی ہوئی ہو جو اس مطلوبہ بھلائی سے کہیں بڑی ہو۔ [منهاج السنة: ٤/ ٥٣٥]

ابن اشعث کے فتنۂ بغاوت میں ملوث ہونے پر امام شعبی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ اس وقت آپ کی عقل و فہم نے کام کیوں نہ کیا؟ (یعنی آپ عقل و بصیرت رکھنے کے باوجود کیونکر اس فتنہ میں ملوث ہو گئے؟) تو جواب میں انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

عوى الذئب فاستأنست بالذئب إذ عوى
وصوّت إنسان فكدت أطير

''جب بھیڑیے نے آواز نکالی تو میں اس سے مانوس ہو گیا اور جب انسان نے آواز بلند کی تو میں اس سے بدک گیا۔''

یعنی اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے قتال و بغاوت میں حصہ لینے پر ندامت ظاہر کی۔

[منهاج السنة : ٤ / ٥٢٩]

(۲) علاوہ ازیں خروج و بغاوت کے ان واقعات کے وقوع پذیر ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ لوگ حکام کے فسق کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے تئیں انھیں کافر سمجھتے ہوئے آمادۂ قتال ہوئے تھے، جیسا کہ حجاج بن یوسف کے بارے میں اس کے مخالفین کا عقیدہ تھا کہ وہ کافر و خارج من الاسلام ہو چکا ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ امام اوزاعی رحمہ اللہ سے قاسم بن مخیمرہ کا قول بیان کرتے ہیں: ''حجاج نے اسلام کے عہد و پیمان توڑ ڈالے ہیں۔'' ابوبکر بن عیاش عاصم کا قول ذکر کرتے ہیں: ''حجاج نے اللہ تعالیٰ کی ہر حرمت کو پامال کر ڈالا ہے۔''

اعمش بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا حجاج کے بارے میں اختلاف ہوا تو انھوں نے امام مجاہد سے اس کے بارے پوچھا تو انھوں نے فرمایا: ''تم مجھ سے اس بڈھے کافر کے متعلق پوچھتے ہو؟''

امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حجاج جبت و طاغوت (انسانی خداؤں) پر ایمان لانے والا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنے والا ہے۔'' امام سفیان ثوری امام طاؤس رحمہ اللہ کا قول نقل فرماتے ہیں: ''مجھے اپنے عراقی مسلمان بھائیوں پر بڑی حیرت ہے کہ حجاج کو مومن کہتے ہیں۔''

[البداية والنهاية : ٩ / ١٣٦]

ابن کثیر رحمہ اللہ مزید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مبیر (تباہ کن، ہلاکت انسان) کی پیش گوئی فرمائی تھی وہ یہی حجاج ہے۔ بلاشبہ وہ ناصبی [1] اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں سے بغض رکھنے والا تھا اور معمولی شبہ کی بنا پر سزائے موت دینے اور

---

[1] ناصبی، رافضی (شیعہ) کی ضد ہے یعنی وہ لوگ جو بنو امیہ کی حمایت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ و اہل بیت سے دشمنی رکھتے ہیں۔

خون ریزی کرنے میں بے باک اور انتہائی سخت گیر تھا۔ اس سے منسوب ایسے ایسے اقوال و الفاظ موجود ہیں جن کا کھلا اور صاف کفریہ مطلب بنتا ہے۔ اگر فی الواقع اس نے ایسے کفریہ الفاظ سے توبہ کر لی تھی تو ٹھیک، ورنہ وہ ان کی ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ امکان بہر حال باقی ہے کہ شیعہ نے بہت کچھ گھڑ کر اس کی طرف منسوب کر ڈالا ہو اور وہ اصل میں اس سے بری ہو۔ [البداية والنهاية : ٩ / ١٣٢]

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور علماء کے نزدیک تابعین اور اس زمانے کے علماء و صلحاء کا حجاج کے خلاف بغاوت کرنا صرف اس کے فسق کی وجہ سے نہ تھا بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس نے شریعت کو بدل ڈالا ہے اور علانیہ کفر کا ارتکاب کیا ہے اور خلیفۂ وقت کو پیغمبر علیہ السلام پر فضیلت دی ہے۔

اس بارے میں انھوں نے اس کے کئی قبیح اقوال بھی بیان کیے ہیں۔

[شرح مسلم للأبي : ٥ / ١٨٠]

④ مگر دوسری جانب ہمیں اس دور کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین میں سے کچھ جلیل القدر حضرات بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے باغیانہ تحریکوں میں شمولیت سے سختی سے منع کیا، جیسے ابن عباس، ابن عمر، ابن زبیر اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو خروج سے روکا اور ابن عمر اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہم نے اہل مدینہ کو واقعۂ حرہ کے موقع پر بغاوت سے منع فرمایا، حسن بصری اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے فتنۂ ابن اشعث میں حجاج کے خلاف بغاوت سے باز رکھنے کی بھر پور کوشش کی۔ یہ تمام حضرات علم و فضل اور فہم و فراست میں فریق ثانی پر فائق تھے۔ اسی بنا پر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے حتمی اصول بیان فرما دیا ہے کہ ایسے حکام و امراء جو یقینی طور پر ظالم و جابر تو ہوں مگر ان کا کفر غیر یقینی ہو اور اس میں علماء کا اختلاف ہو تو ایسے حالات میں اہل السنۃ کا اتفاق ہے کہ بغاوت کرنا حرام ہے اور صرف صبر و ضبط واجب ہو گا۔ [منهاج السنة : ٤ / ٥٢٩]

...بحث پنجم: شریعت میں ممنوعہ بغاوت اور اس کے مخاطبین:

حکمران کے خلاف بغاوت کرنے والوں میں دو قسم کے لوگ شامل ہیں:

1. ایسا شخص جس نے حاکم وقت کی بیعت کی (یعنی اس کے اقتدار کو تسلیم کر لیا) پھر اس بیعت کو توڑ ڈالا اور بغاوت کر دی۔
2. ایسا شخص جس پر بیعت لازم (واجب) ہوئی مگر اس نے نہیں کی اور پھر بغاوت کر دی۔ ایسے لوگوں کی کئی اقسام ہیں، ان میں عوام شامل ہے جن پر اس لیے بیعت لازم ہوتی ہے کہ اہل حل وعقد نے (حاکم کی) بیعت کر لی ہوتی ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ہے:

''تین اہل خصلتیں ایسی ہیں کہ جنھیں اختیار کرنے میں کسی مسلمان کا دل تنگ نہیں ہونا چاہیے، یعنی خالص اللہ کی رضا کی خاطر عمل کرنا، مسلم حکام کے ساتھ ...اسی خیر خواہی کا رویہ رکھنا اور ان (مسلمانوں) سے مل اور جڑ کر رہنا، اس لیے کہ (اتحاد و اتفاق کی برکت سے) دعائیں انھیں اپنی حفاظت میں رکھیں گی۔''

[ترمذي : ٢٦٥٨]

امام نووی، ابن حجر اور مازری رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ نیا حاکم یا خلیفہ مقرر ہونے پر صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اصحاب حل وعقد [1] اور با اثر معززین اس کی بیعت کر کے اسے تسلیم کرنے کا اعلان کر دیں۔ فرداً فرداً ہر کسی کا بیعت کرنا ضروری نہیں اور نہ ہی ایسا ممکن ہے، بلکہ اکابر و روسا کے بیعت کر لینے سے عامۃ الناس پر بھی اس کی پابندی اور سمع و طاعت لازم ہو جائے گی۔ [فتح الباري : ٧/٥٦٥]

بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ محض چار، دو یا ایک فرد کے بیعت کر لینے سے حاکم کا حق اقتدار قائم ہو جاتا ہے، درست نہیں ہے اور نہ ہی علمائے اہل السنۃ میں سے کسی نے ایسا کیا ہے،

---

[1] اہل حل وعقد، یعنی وہ علماء و روسا جو معاملات سلجھانے اور طے کرنے والے اور با اثر ہوں، جن کے تعاون سے نظام مملکت چلتا رہے اور حاکم کے ہاتھ مضبوط ہوں۔

بلکہ ان کے نزدیک تو حق حکمرانی صرف اس وقت قائم ہو گا جب قوت و شوکت رکھنے والے سرکردہ عناصر کی اکثریت بیعت کر لے اور اگر ان میں سے چند لوگ ایسا نہ بھی کریں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور حاکم وقت کا بجا طور پر اقتدار قائم ہو جائے گا، جس کی پابندی سب پر واجب ہو گی اور اس کے خلاف بغاوت حرام ہو گی، جیسا کہ بکثرت آنے والی احادیث میں اس مسئلے کا واضح بیان موجود ہے۔

مبحث ششم: علماء و حکام پر عدم اعتماد اور اعتراض خروج کا مقامِ آغاز ہے

تاریخ اسلام پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ علماء و حکام پر بدگمانی اور بے جا تنقید ہی خروج و بغاوت کا اصل سبب ہے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے اندازِ حکومت پر الزامات و اعتراضات کا طومار باندھنے اور پھر اسی بنیاد پر بغاوت کرتے ہوئے ان کے خون سے ہاتھ رنگنے کا سبب یہی تھا کہ باغیوں نے نہ تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے حسن ظن سے کام لیا (حالانکہ وہ اس وقت افضل ترین صحابی تھے) اور نہ ہی دیگر جلیل القدر صحابہ، سیدنا علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہم پر اعتماد کیا، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر عظیم تابعین سے کٹ کر خلیفۂ راشد سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ پر ہتھیار اٹھائے اور بالآخر ان کا ناحق خون بہایا۔ دراصل یہ لوگ اپنے جدامجد ذوالخویصرہ کے اسوہ کو اپنانے اور اس کی راہ پر چلنے والے ہیں، جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و دیانت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ و مقام پر زبانِ طعن دراز کرتے ہوئے کہا تھا: "اے محمد! تو نے (مالِ غنیمت کی تقسیم میں) انصاف نہیں کیا۔"

پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی معاملہ اسی انداز پر چلتا رہا اور خوارج نے علماء و حکام پر انتہائی سخت زبان درازی کی، حالانکہ ان (علماء و حکام) میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بڑی تعداد شامل تھی، مگر ان لوگوں نے اپنی کم فہمی اور بے عقلی سے قرآن کریم کی فاسد تفسیر کرتے ہوئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ و دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کافر اور واجب القتل قرار دیا اور ان پر ہتھیار اٹھائے، جس سے جنگ نہروان کا واقعہ پیش آیا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان کی جڑ کاٹ دی۔

مگر شر کی چنگاری پھر بھڑک اٹھی اور ان میں سے ایک بد بخت نے اپنے تئیں بہت بڑی نیکی اور سعادت سمجھتے ہوئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔

خوارج کی بنیادی خرابی یہ تھی کہ وہ علماء و حکام پر سخت بد اعتمادی کرتے تھے اور ان کے اس مرض کو سمجھتے ہوئے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنی گفتگو میں ان سے فرمایا: ''میں مہاجر و انصار میں سے تمھارے پاس آیا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد اور داماد کے پاس سے، انھی لوگوں پر قرآن نازل ہوا (یعنی ان کی موجودگی میں) اور وہ قرآن کی تفسیر کو تم سے زیادہ جانتے ہیں اور (تمھاری حالت یہ ہے کہ) تم میں کوئی ایک صحابی بھی موجود نہیں۔''

[مستدرك حاكم : ٢/١٦٤]

اس گفتگو میں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انھیں ان کا وہ بنیادی مرض بتلا دیا جس کی بنا پر وہ اس گمراہی کا شکار ہوئے تھے، یعنی اکابر علماء اور حکام پر اعتماد نہ کرنا اور سوئے ظن و بد اعتمادی کی بنیاد پر اختلاف کھڑا کر کے بغاوت و تصادم کو ہوا دینا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ امت میں ہر بغاوت و خروج اسی مرض کے سبب واقع ہوئی اور گمراہ فرقوں کے بھٹکنے کا سبب بھی یہی بیماری تھی۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام بدعتی فرقوں کی گمراہی کا سبب یہی تھا کہ انھوں نے علمائے حق پر عدم اعتماد کرتے ہوئے اپنے ناقص علم اور فہم سقیم کے بل بوتے پر سلاطین و حکام کو کافر قرار دیتے ہوئے اپنے تئیں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں امت تقسیم ہوئی اور بے حساب فتنہ و فساد پیدا ہوا۔ اس لیے انتہائی ضروری ہے کہ ہر دور میں ایسے علمائے راسخین پر اعتماد کیا جائے جن کا علم و فضل شک و شبہ سے بالاتر ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے انھیں عوام میں عزت و پذیرائی سے نوازا ہو۔ اس اصول کی پابندی خاص طور پر فتنہ و فساد کے وقت بہت ضروری ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل : ٤٣]

''سو ذکر والوں سے پوچھ لو، اگر تم شروع سے نہیں جانتے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ [النساء : ٨٣]

''اور جب ان کے پاس امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر وہ اسے رسول کی طرف اور اپنے حکم دینے والوں کی طرف لوٹاتے تو وہ لوگ اسے ضرور جان لیتے جو ان میں سے اس کا اصل مطلب نکالتے ہیں۔''

امام سعدی رحمہ اللہ اس آیت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''اس سے ایک اصول ثابت ہوا کہ اہل اسلام کے کسی بھی انتشار و اختلاف کے وقت اصل فریضہ یہ ہے کہ اس معاملے کو ذمہ دار علماء اور اہل حل وعقد کے سپرد کیا جائے اور ان کے فیصلے کی پابندی کی جائے۔ یہی راستہ سچائی تک پہنچانے والا اور خطا ولغزش سے محفوظ رکھنے والا ہے۔''

[تفسير سعدي : ١/ ١٩٠]

شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حکام کے خلاف بغاوت میں شر و فساد کی خبر صرف احادیث ہی میں نہیں آئی بلکہ متواتر واقعات بھی اس چیز کی بڑی گواہی دیتے ہیں، جیسا کہ ہر زمانے میں کم عمر نوجوانوں نے حکومت مخالف تحریکیں برپا کیں اور ان کے نتائج تباہ کن ثابت ہوئے۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ انھوں نے اہل علم کی حق تلفی کرتے ہوئے اور ان کی آراء و فتاویٰ کو پس پشت ڈالتے ہوئے محض اپنے جذبات کی رو میں بہ کر اقدامات کیے، جن کا نتیجہ انتہائی بھیانک نکلا۔ ہر دور میں ایسے انقلابی عناصر کا مشترکہ مرض یہی نظر آتا ہے کہ انھوں نے علمائے حق پر زبان درازی کی، انھیں نا اصل قرار دیا اور انھیں حیض و نفاس اور وضو کے علماء ہونے کا طعنہ دیا۔ یہ مرض صرف دورِ حاضر ہی کا نہیں بلکہ

...ماۂ قدیم سے اہل بدعت اور راہِ حق سے منحرف گروہوں کا بھی یہی چلن رہا ہے۔
...امام شاطبی رحمہ اللہ ایک معتزلی عالم واصل بن عطاء کا قصہ بیان فرماتے ہیں کہ اس کے
...وعظ کے دوران اس کے ایک ساتھی عمرو بن عبید نے حاضرین کو مخاطب ہو کر کہا: ''سن
...رہے ہو؟ حسن بصری اور ابن سیرین کا کلام، ہمارے شیخ (معتزلی) کے مقابلے میں
...حیض سے آلودہ، پھینکے ہوئے چیتھڑے کی مانند ہے۔'' [الاعتصام: ٧٤٢]
ہر بدعت اسی فکر سے پیدا ہوتی، پھر پروان چڑھتی اور آخر کار اپنی انتہا کو پہنچ کر ہتھیار
...اٹھانے اور خون ریزی پر منتج ہوتی ہے۔
ابو قلابہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب بھی کسی نے کوئی بدعت ایجاد کی تو بالآخر اس نے
...بغاوت وقتال کے لیے ہتھیار بھی اٹھائے۔'' [مصنف عبد الرزاق: ١٠/ ١٥١]
تو جب بھی آپ کسی ایسے شخص کو دیکھیں جو علماء پر طعن کر رہا ہے اور اپنے آپ کو مفتی
...یا ایسے بندے کو فتوے کا اہل قرار دے رہا ہے جو فتوے کی اہلیت نہیں رکھتا تو سمجھ جائیں وہ
...بدعت وخوارج کے منہج پر ہے، بدعتی اور فتنہ پرور ہے، آپ اس سے بچ جائیں۔ اللہ ہمیں اور
آپ کو اپنی عافیت میں رکھے۔

...بحث ہفتم: تین شرائط کے بغیر بغاوت جائز نہیں:

گزشتہ گفتگو میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ ظلم اور فسق وفجور کی بنا پر مسلم حاکم کے خلاف
بغاوت جائز نہیں، یہاں ہم اس بات کا ذکر کریں گے کہ حکمران کے خلاف بغاوت کے
لیے تین شروط کا ہونا ضروری ہے:
(1) حاکم کسی ایسے کھلے اور واضح کفر کا مرتکب ہو جائے جس میں کسی کو کوئی شک وشبہ یا
اختلاف نہ ہو، جیسے خدانخواستہ وہ اللہ اور رسول ﷺ کو گالی دے یا کسی اور دین کو
اختیار کر لے یا شریعت اسلامیہ کو ظالمانہ قرار دے، یا یہ کہے کہ یہ (شریعت اسلامیہ)
آج کے دور کا ساتھ نہیں دے سکتی یا اس سے ملتی جلتی بات کہے۔ یہ سب باتیں کھلا

کفر ہیں اور حدیث کے الفاظ میں یہ معنیٰ شامل ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارے پاس اللہ کی طرف سے واضح دلیل موجود ہو۔'' [بخاري : ۷۰۵٦]

یعنی حکمران کے کافر ہو جانے کے بارے میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے، محض شک یا گمان کی بنیاد پر اس پر کفر کا الزام نہ لگ رہا ہو، بلکہ اس کے لیے برہانِ الٰہی موجود ہو۔ چنانچہ محض گمان کی بنیاد پر حاکم کے کفر کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا، جس کی مثالیں درج ذیل ہیں:

① حاکم زکوٰۃ کا نظام چھوڑ دے یا انسانی قوانین کے مطابق فیصلہ دینا شروع کر دے، مگر اس کا یہ عقیدہ نہ ہو کہ انسانی قوانین پر عمل جائز ہے، یا یہ اسلامی قوانین سے بہتر ہیں، یا اسی طرح کسی ایسے قول یا عمل کی بنا پر اسے کافر نہیں کہا جائے گا جس کے کفر ہونے یا نہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہو۔

② حاکم کے بظاہر کفریہ قول و فعل میں کسی تاویل و شبہ کی گنجائش نہ ہو اور نہ ہی وہ مجبوراً ایسا کہہ یا کر رہا ہو، کیونکہ بسا اوقات آدمی لاعلمی، کم فہمی یا اس سے ملتے جلتے کسی عذر کی بنا پر ایسی بات کہہ دیتا یا ایسا فعل کر گزرتا ہے، جس پر بظاہر کفر کا گمان ہوتا ہے، مگر درحقیقت وہ مسئلے کی نوعیت سے لاعلم ہوتا ہے، مثلاً وہ نیا مسلمان ہوا ہو اور مسائلِ شرعیہ سے نابلد ہو، یا مسلمانوں سے دور دیارِ کفر میں رہتا ہو، یا اس نے شرعی حکم سنا ہی نہ ہو، یا اس کے نزدیک وہ حکم ثابت شدہ نہ ہو وغیرہ۔

اس بارے میں بخاری و مسلم کی اس حدیث کا حوالہ بہت مناسب ہے جس میں آپ ﷺ نے اس آدمی کا قصہ بیان فرمایا جس نے مرتے وقت اپنی بدعملی کے خوف سے اپنے ورثاء کو اپنی لاش جلا کر راکھ ہواؤں اور سمندروں میں بکھیر دینے کی وصیت کی تھی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عذر یہ بیان کیا تھا کہ یہ سب کچھ تیرے خوف سے کیا ...... تو اس کی بخشش ہو گئی۔ اب غور کریں کہ اس نے اپنی جہالت کے سبب اللہ تعالیٰ کو ''المعید'' (دوبارہ زندگی دینے والا) اور ''الحاشر'' (دوبارہ اکٹھا کرنے والا) نہ سمجھا اور اللہ کی ان دونوں عظیم الشان صفات کا انکار کیا جو کہ بالاتفاق کفریہ عقیدہ ہے، مگر اس کے اس ناقص ایمان

اور خوفِ خدا کی وجہ سے اس کی بخشش کر دی گئی۔ جب ایسے شخص کی مغفرت کا سامان ہو سکتا ہے تو کسی ایسے مجتہد کی بخشش کیونکر نہ ہو گی جو اپنی فہم و بصیرت کی حد تک بھلائی کا متلاشی ہوتا ہے، مگر لاعلمی اور کم فہمی کے سبب حقیقت تک رسائی نہیں پا سکتا اور خطا کا شکار ہو جاتا ہے، خواہ وہ حاکمِ وقت ہو یا عام فرد ہو، دونوں صورتوں میں اس کے لیے معافی کی گنجائش موجود ہے۔ خصوصاً حکمران ایسی گنجائش کے زیادہ حق دار ہیں کہ تاویلات اور شکوک و شبہات سے زیادہ واسطہ انھیں ہی پڑتا ہے، کیونکہ ان کے پاس علمائے سوء بھی ہوتے ہیں اور ان کے حواری و مشیر بھی تلبیسِ حق کرتے اور باطل کو مزین کر کے پیش کرتے ہیں، جس سے ان کے بھٹکنے کے مواقع بڑھ جاتے ہیں اور کسی بھی زمانہ میں ایسے حالات کی کمی نہیں رہی چہ جائیکہ عہدِ حاضر...... اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

کبھی کبھی حاکم وقت پر وہ امور بھی نہیں کھلتے جن سے عامۃ الناس بخوبی واقف ہوتے ہیں، کیونکہ وہ امورِ مملکت میں بہت مصروف ہوتا ہے اور اہل خیر عموماً اس سے دور ہوتے ہیں، بالخصوص اس زمانے میں۔ لہٰذا حکمرانوں کی تکفیر میں تردّد کرنا بہت ضروری ہے، کیونکہ انھیں کافر قرار دینے میں بہت خطرناک عواقب و نتائج پوشیدہ ہوتے ہیں۔

(۳) پہلی دو شرطوں کے پورا ہو جانے کے بعد تیسری شرط کا پایا جانا بھی ضروری ہے کہ کافر حکمران کو ہٹانے اور گرانے کی پوری طاقت اور صلاحیت موجود ہو۔ اس کی دلیل قرآن کریم کا بیان کردہ یہ عمومی اصول ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة : ٢٨٦]

''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''جب میں تمھیں کسی کام کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اس پر عمل کرو۔''

[بخاري : ٧٢٨٨]

لہٰذا بغاوت کرنا اور اسے کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانا اس امر کا محتاج ہے کہ

باغیوں کے پاس اتنی استعداد و قوت موجود ہو کہ وہ اس عمل کو اس کے انجام خیر تک پہنچا سکیں، ورنہ صرف خون ریزی اور غارت گری کے لیے شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی اور یہ یقین بھی ضروری ہے کہ اپنے مقصود کے حصول کے لیے کوئی ایسا ضرر و فساد نہیں ہو گا جو اس مقصود سے کہیں بڑھا ہوا ہو، کیونکہ شرعی اصول بھی یہی ہیں اور دنیا جہان کے عقلاء اس پر متفق ہیں کہ چھوٹے ہدف کو پانے کے لیے اس سے بڑا نقصان نہ کیا جائے اور انفرادی و اجتماعی انسانی زندگی میں ہر جگہ یہی قاعدہ کارفرما نظر آتا ہے کہ انسان کسی بھی مقصد کے حصول کے لیے اس مقصد سے بڑھی ہوئی قیمت کبھی نہیں ادا کرتا اور نہ ہی اس فطری اصول کی خلاف ورزی کی اجازت شریعت اسلامیہ ہی دیتی ہے۔ چنانچہ اسلامی فقہ کی رو سے یہ متفق علیہ اصول طے پایا کہ ''کسی برائی کو اس سے بڑی برائی کی قیمت پر دور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جن سے کسی نقصان کے بغیر اسے (برائی کو) دور یا کم کیا جا سکے۔''

المختصر یہی وہ راہِ مستقیم ہے کہ جس پر چل کر ہی اہل اسلام کے دینوی و اخروی مفادات کا حصول ممکن ہے اور اسی میں ان کے جان و مال اور عصمت و حرمت کی سلامتی مضمر ہے۔

شیخ صالح بن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:



اگر ہم کافر حکمران کا تختہ الٹنے اور کامیاب بغاوت پر قادر ہیں تو ضرور ایسا کریں گے، لیکن اگر ایسی قوت و استطاعت میسر نہ ہو سکی تو خروج و بغاوت ہم پر حرام ہوگی، کیونکہ شریعت میں قوت و طاقت کی عدم موجودگی میں کوئی فریضہ بھی ہم پر عائد نہیں کیا گیا۔ پھر اس میں یہ قباحت بھی موجود ہے کہ اگر ہم اپنی باغیانہ جدو جہد میں ناکام رہے تو اہل حق کی عزت و حرمت پہلے سے زیادہ پامال ہو گی اور اہل باطل کا تسلط و جبر مزید بڑھ جائے گا۔ یہ ایسا نازک مسئلہ ہے جس میں جذبات سے زیادہ فراست اور جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہے۔ جرأت و

شجاعت کے لیے بلاشبہ جذبات درکار ہیں، مگر حصولِ مقصد کے لیے اس کے ساتھ ساتھ عقل وشریعت کی راہ نمائی اشد ضروری ہے۔''

[لقاء الباب المفتوح (٥١) سوال: ١٢٢٢]

اس امر سے آگاہی بھی ضروری ہے کہ زمانۂ قدیم میں خروج و بغاوت پر مبنی کارروائیاں جو یقینی کفر کے خلاف کی گئی تھیں، مگر ان کا نتیجہ حسب منشا برآمد نہ ہوا، بلکہ بے حساب ہلاکتوں اور لاتعداد عصمتوں کی پامالی اور امن وامان کی بربادی کی صورت میں اہل اسلام کو اس کا وبال برداشت کرنا پڑا اور یہ سب کچھ اس دور میں ہوا جب جنگ کرنے والے دونوں گروہوں میں نوعیت کے لحاظ سے قوت کا کچھ فرق نہ تھا، دونوں طرف اسلحہ اور رائج نقل وحرکت ایک جیسے تھے، جبکہ عصرِ حاضر میں حکومتیں اسلحہ کی برتری کے اعتبار سے اس قدر فائق وغالب ہیں کہ بغاوت کی صورت میں ان کے مدمقابل لڑنے والوں کی کوئی استطاعت نہیں، جیسا کہ شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تم حکومت کی باقاعدہ اور مسلح افواج کے مقابلے میں باورچی خانے کی چھری لے کر نکلو گے، جبکہ دشمن کے پاس طیاروں، ٹینکوں اور توپوں کی شکل میں ایسا اسلحہ موجود ہے کہ ان سے لڑنا محض خودکشی ہے۔''

[شرح رياض الصالحين ٤ / ٥١٥]



فصل پنجم

خوارج کے شبہات سے متعلق چند اہم مباحث

مبحثِ اوّل: انسانی وضعی قوانین کا حکم:

اس مبحث میں اس امر کا جائزہ لیا جائے گا کہ ایک یا چند مقدمات میں انسانی وضعی قانون پر فیصلہ دینا اور مستقل وضعی قانون بنانا اور انھیں نافذ کرنا، دونوں صورتوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اور جو لوگ اس میں فرق کرتے ہیں ان کا نظریہ بہت کمزور ہے، ان کے نزدیک پہلی صورت میں ایسا کرنے والا محض معصیت کا مرتکب ہو کر گناہ گار کہلائے گا، جبکہ دوسری شکل میں وہ کفرِ اکبر کا ارتکاب کرے گا اور دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ یہ تفریق اہل سنت کے مسلمہ اصول کے خلاف ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ صرف گناہ کو حلال سمجھنا ہی کفرِ اکبر ہے اور اس میں ایک یا زیادہ بار تھوڑے اور زیادہ کا کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

فرض کیجیے کہ دو آدمی منصب عدالت پر فائز ہیں، ایک کے پاس قانونِ شریعت برائے فیصلہ موجود ہے جبکہ دوسرا قانونِ شریعت کا مخالف ہے، تو پہلے منصف کے پاس جب بھی کوئی مقدمہ آتا ہے تو وہ قانونِ شریعت سے ہٹ کر فیصلہ کر دیتا ہے اور دوسرا منصف بھی اسی طرح اپنے بنائے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہے تو ان دونوں میں کیا فرق ہوا؟ کیا محض اس بات سے پہلے کو مسلمان سمجھا جائے گا کہ بہر حال اس کے پاس قانونِ شرعی لکھا ہوا موجود ہے اور دوسرا شخص اسے مانتا ہی نہیں؟ جبکہ عمل دونوں کا برابر ہے کہ دونوں انسانی قانون پر چل رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پہلو سے ان دونوں پر کوئی فتویٰ لگانا درست

نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے کچھ اور اعتبارات کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہیں کہ انسانی وضعی قانون پر فیصلہ دینے والے کا اگر عقیدہ یہ ہے کہ انسانی قانون شرعی قانون سے برتر اور افضل ہے تو بلاشبہ یہ کفر اکبر ہے اور اس کا فاعل اسلام سے خارج ہے، خواہ وہ ایک بار ایسا فیصلہ دے یا ہمیشہ اور مستقل ایسا کرے، جیسا کہ اہل سنت کا اصولی عقیدہ ہے کہ کفریہ عمل تھوڑا ہو یا زیادہ، اس میں کوئی فرق نہیں، دونوں کے ارتکاب سے کفر لازم آئے گا اور جو عمل کفریہ نہیں محض معصیت ہے اس کے بار بار ارتکاب سے بھی آدمی کافر نہیں بلکہ صرف گناہ گار اور عاصی ہوگا۔ مثلاً تھوڑے یا زیادہ مال کی چوری اور معمولی یا بکثرت شراب نوشی میں فرق نہیں ہوگا اور دونوں پر ایک ہی سزا کا اطلاق کیا جائے گا۔ اسی طرح اس مسئلہ میں بھی کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی کہ کسی ایک مقدمے یا زیادہ مقدمات میں علیحدہ علیحدہ فتویٰ دیا جائے اور نہ ہی وضعی قوانین بنانا اور ان کے مطابق فیصلہ دینا ہی موجب کفر ہے، بلکہ ان تمام امور میں اصولی اور بنیادی چیز صرف یہ ملحوظ رکھی جائے گی کہ فیصلہ کرنے والا اسے حلال جانتا ہے یا انھیں شرعی قوانین پر ترجیح یا فضیلت دیتا ہے تو ایسی صورت میں وہ بالیقین کافر ہوگا جبکہ اس کے بغیر وہ صرف معصیتِ کبریٰ کا مرتکب گردانا جائے گا۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”درست بات یہ ہے کہ انسانی قوانین پر فیصلہ دینا قاضی کے حالات کے اعتبار سے کفر کی دونوں قسموں کا احتمال رکھتا ہے، اگر اس نے قانونِ الٰہی کو فرض مانتے ہوئے اور اپنے آپ کو گناہ گار جانتے ہوئے انسانی قانون پر فیصلہ دیا تو یہ کفرِ اصغر اور کبیرہ گناہ ہے اور اگر اس نے یہ سمجھا کہ قانونِ شریعت پر چلنا ضروری نہیں بلکہ مجھے اس معاملے میں اختیار حاصل ہے کہ چاہوں تو اس کی پابندی کروں یا چاہوں تو اسے چھوڑ کر انسانی قانون کو عمل میں لاؤں، تو یہ کفر اکبر ہے اور اگر وہ بالکل ہی قانونِ الٰہی سے بے خبر تھا یا غلطی سے انسانی قانون

کو خدائی قانون جان کر فیصلہ دے دیا تو ایسا شخص خطا کار ہے اور اس پر اسی حساب سے فتویٰ لگایا جائے گا۔" [مدارج السالکین: ۱/ ۳۳۶]

یہاں مزید یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ دورِ حاضر میں انسانی قانون سازی پر کفر کا فتویٰ لگانے والے علماء نے اس مسئلہ کو اجماعی مسئلہ قرار نہیں دیا کہ جس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس سے اختلاف کرنے والوں پر مرجئہ [1] ہونے کا الزام عائد کیا ہے، بلکہ یہ مسئلہ بھی ترکِ نماز اور عدم ادائیگی زکوٰۃ کی طرح اختلافی ہے کہ ایسے لوگوں کو کافر کہا جائے گا یا نہیں؟ اسی طرح خوارج کو کافر کہا جائے گا یا نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ علماء اس مسئلہ میں اپنے موقف سے رجوع کرتے نظر آتے ہیں، جیسا کہ ابن عثیمین رحمہ اللہ نے اس بارے میں اپنا نظریہ ترک کر کے شیخ ابن باز اور امام البانی رحمہ اللہ کا موقف قبول کیا۔

اسی لیے شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ اس مسئلہ میں ان الفاظ کے ساتھ اپنا موقف بیان فرماتے ہیں: "میرے نزدیک مسئلہ یوں ہے یا مجھے اس مسئلہ کی یوں سمجھ آئی" یا اسی طرح کے دوسرے محتاط الفاظ استعمال فرماتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ اور یہ انداز اجماعی اور متفق علیہ مسائل میں اختیار نہیں کیا جاتا، بلکہ ان الفاظ سے سمجھ یہ آتی ہے کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے، جس میں علماء کی آراء و فتاویٰ الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ شیخ ابن عثیمین نے بھی صرف انسانی قوانین بنانے اور ان کے مطابق فیصلہ دینے کو کفر قرار نہیں دیا، بلکہ ایسی صورت میں کفر کہا ہے جب بنانے اور چلانے والے انھیں قانونِ شرعی پر فضیلت دیں۔ یہی بات اہل سنت کے ہاں طے شدہ ہے۔ جس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے جس کی بنیاد پر حکام کے خلاف بغاوت و سرکشی جائز قرار نہیں دی جا سکتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان (حکام) کا کفر واضح اور متفق علیہ ہو جس میں کسی تاویل اور شبہ کی گنجائش بھی نہ ہو۔ درج ذیل فرمانِ رسول ﷺ کا مطلب بھی یہی ہے:

---

[1] فقہی اصطلاح میں مرجئہ ایسے گمراہ مکتب فکر کو کہا جاتا ہے جن کے نزدیک ایمان لے آنے کے بعد انسان کو کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس کا ایمان سلامت رہتا ہے۔

''اگر تم ان (حکام) میں ایسا کفر دیکھو کہ جس کی واضح دلیل اللہ کی طرف سے تمھارے پاس موجود ہو۔'' [بخاري : ٧٠٥٦]

...دوم: اہل السنہ اور ضابطہ استحلال [1]

کسی بھی معصیت کے ارتکاب پر اس کے فاعل کو اس گمان کی بنیاد پر کافر قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اسے جائز یا حلال خیال کرتا ہے، جب تک اس کی زبان یا قلم سے ایسے الفاظ ... ادا نہ ہوں کہ وہ اسے جائز تصور کرتا ہے۔ اسی لیے اہل السنہ کا بنیادی عقیدہ یہی ہے کہ محض ارتکاب معصیت پر کسی کی تکفیر نہ کی جائے۔ اس کے برعکس خوارج اور معتزلہ اس کی تکفیر کرتے ہیں۔ اہل السنہ کے دلائل عقیدہ کی کتب میں بکثرت کھول کر بیان کیے گئے ہیں، ... ہم یہاں صرف استحلال کا معنی و مطلب اور اس پر لگنے والا شرعی حکم ہی بیان کیا جائے گا۔

استحلال:

استحلال یہ ہے کہ شریعت کے طے شدہ حرام کو حلال جاننے والا شخص کافر اور اللہ و رسول ﷺ کا مخالف ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس لیے کہ خون کو حلال کر دینے والے کفر میں اگر اعتقاد کی شرط لگا دی جائے تو پھر جو شخص محض عملاً گالی دے نہ کہ اعتقاداً تو اسے قتل کرنا یا کافر کہنا ہرگز جائز نہ ہوتا۔'' [الصارم المسلول : ٣/ ٩٦٤]

چنانچہ ثابت ہوا کہ استحلال ایک ایسا عمل ہے جس کا تعلق دل سے ہے اور کسی کو اس کی خبر اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک زبان یا تحریر سے اس کی گواہی نہ قائم ہو جائے۔

---

[1] استحلال، یعنی کسی بھی چھوٹے یا بڑے گناہ اور معصیت کو جائز اور حلال سمجھنا اور اسے برائی خیال نہ کرنا۔ یاد رہے کہ بسا اوقات انسان کے کفر کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ کسی کفریہ فعل کا ارتکاب کرے اور کبھی کبھی فعل کے ساتھ اعتقاد شرط ہوتا ہے۔

محض کسی کا عملِ معصیت قطعاً اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ جائز یا روا سمجھ کر کرنا، اس کا مرتکب ہو رہا ہے۔ ہاں! اگر اپنی زبان، اپنی تحریر یا یقینی طریقے سے اس کا اظہار کر دے تو یقیناً استحلال کے مجرم کی حیثیت سے وہ کافر ٹھہرے گا۔ اسی لیے اہل السنہ گناہوں اور نافرمانیوں کے مرتکب کو محض اس کے فعل کی بنیاد پر کافر قرار نہیں دیتے، کیونکہ صرف گناہ کفر کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ خوارج ہی کبیرہ گناہ کے مرتکب کو کافر ٹھہراتے ہیں۔

فرمانِ ربانی ہے:

﴿اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ ۚ وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ﴾ [التوبة : ٣١]

''انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''میں گلے میں طلائی صلیب لٹکائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عدی! اسے اتار پھینکو، یہ بت ہے۔'' میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ توبہ کی یہ آیت تلاوت فرماتے ہوئے سنا: ﴿اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس آیت کی تفسیر میں) فرمایا کہ نصاریٰ اپنے علماء و رہبان کی عبادت و پرستش نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ وہ ان کی حلال کردہ اشیاء کو حلال اور حرام کردہ اشیاء کو حرام ماننے لگ جاتے تھے (یہی طرزِ عمل دراصل انھیں رب ٹھہرانے کے مترادف ہے۔) [ترمذي : ٣٠٩٥]

کیونکہ کسی چیز کو حلال وحرام قرار دینے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے جو اگر مخلوق میں سے کسی کو دے دیا جائے تو یہ کفر وشرک کا عمل ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ نصاریٰ کا یہ عمل اس اعتبار سے شرک میں داخل ہے کہ انھوں نے یہ جانتے اور سمجھتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز کو حرام اور فلاں کو حلال قرار دیا ہے پھر بھی اپنے مذہبی پیشواؤں کی عقیدت میں اس حد تک آگے چلے گئے کہ اللہ کی شریعت کو تبدیل کیے جانے پر بھی وہ ان کی پیروی سے باز نہ آئے اور اپنے اس عمل سے انھوں نے گویا انھیں شریعت سازی کا اختیار دے دیا اور یہ عمل یقیناً بدترین شرک ہے، جس کے ارتکاب پر قرآن کریم میں ان کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ [مجموع الفتاوی: ۷/ ۷۰]

علامہ ابو بکر ابن العربی رحمہ اللہ تفسیر قرطبی میں رقم طراز ہیں:

''مومن کسی مشرک کی اطاعت کرنے پر صرف اس وقت مشرک ٹھہرتا ہے جب وہ اعتقاد وعمل دونوں سے اس کی اطاعت کرے، مگر جب وہ عمل میں اطاعت کرے اور اس کا عقیدۂ توحید سلامت رہے تو پھر وہ محض گناہ گار ہوگا۔''

[تفسیر القرطبي: ۷/ ۷۸]

اس کلام سے ثابت ہو گیا کہ استحلال کسی حرام کردہ چیز کو دل سے حلال جاننے کا نام ہے، جسے زبان سے اقرار کرتے ہوئے ظاہر بھی کیا جائے، صرف فعل وعمل سے کسی معصیت کا ارتکاب خواہ مسلسل کیا جائے ہرگز استحلال نہیں کہلا سکتا۔ ہاں! اگر کوئی عمل بذات خود کفریہ عمل ہے تو یقیناً اس کا ارتکاب کفر ہی ہوگا، جیسے کسی بت کو سجدہ کرنا، قرآن کریم کی توہین کرنا اور اللہ و رسول ﷺ کو سب وشتم کا نشانہ بنانا، ان جیسے افعال پر عقیدے کی چھان بین میں پڑے بغیر ہی کفر کا فتویٰ لگا دیا جائے گا۔

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''استحلال کا معنیٰ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال سمجھے۔ رہی

بات استحلالِ فعلی کی تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ وہ فعل بذاتہ کفریہ فعل ہے یا نہیں؟ اگر وہ فعل کفریہ ہے تو کرنے والا کافر ٹھہرے گا، ورنہ صرف عاصی و گناہ گار قرار پائے گا۔ مثلاً کوئی شخص سودی لین دین کرتا ہے مگر دل سے سمجھتا ہے کہ یہ حرام کام ہے، تو وہ کافر نہیں ٹھہرایا جائے گا صرف عاصی ہوگا۔ لیکن اگر وہ یہ کہے کہ سودی لین دین جائز و حلال ہے تو وہ ضرور کافر قرار دیا جائے گا، کیونکہ اس نے قانونِ شریعت کو جھٹلا دیا ہے اور سود کو حرام ٹھہرانے کے خدائی فیصلے کو ٹھکرا دیا ہے۔ مختصر یہ کہ استحلال دو قسم کا ہوا: استحلال فعلی اور استحلال قلبی۔ استحلال فعلی میں دیکھا جائے گا کہ یہ فعل بذاتِ خود کفر ہے یا نہیں؟ اور استحلال قلبی میں بہر حال آدمی کو کافر قرار دے دیا جائے گا۔

[لقاء الباب المفتوح، مجلس : ٥٠، سوال : ١٢٠٠]

مبحث سوم: اہل السنہ کے نزدیک امام کون؟

اہل السنہ کے نزدیک امام (حکمران) وہ ہے جسے ایسا غلبہ و قوت حاصل ہو جس سے مقصدِ حکمرانی حاصل ہو سکے۔ امامت (حکمرانی) کا موضوع دورِ حاضر میں انتہائی اہمیت اختیار کر گیا ہے، کیونکہ اہل بدعت نے اس مسئلے میں بہت تلبیس کر کے ایسے تصورات گھڑ لیے ہیں کہ جن کا دین سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں، مثلاً روافض نے ایسے خیالی امام بنا لیے کہ جن کا کوئی حقیقی وجود نہیں اور نہ وہ اس قابل ہیں کہ اپنے ماننے والوں سے اپنے احکام منوا سکیں یا کم از کم اپنا وجود ہی تسلیم کرا سکیں۔

اہل السنہ کے نزدیک امام وہ ہے جو حکمرانی کے مقاصد پورے کر سکے اور جس کے پاس اتنی قوت و قدرت ہو کہ رعایا سے اپنے احکام کی تعمیل کرا سکے اور رعیت کے حقوق کی ادائیگی سمیت حکمرانی کے سارے تقاضے نبھا سکے۔

ابو الحسن زاغونی فرماتے ہیں کہ امامت کے مقاصد میں شرعی سیاست کا قیام، غلبہ حق کی

جستجو، رعایا و مملکت کی اصلاح و درستی کی تدابیر، دینِ حق کی نصرت کے لیے افواج کی ترتیب و تنظیم، سرحدوں کا نظام، باطل و کفر اور ظلم و زیادتی کا خاتمہ اور مظلوم و مقہور لوگوں کی دادرسی جیسے امور شامل ہیں۔

حکمرانی کے لیے مطلوبہ قوت و اقتدار کے حصول کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اہل حل و عقد اس (امام) کے ہاتھ پر بیعت کریں اور یہ لوگ اپنے اپنے قبائل اور علاقوں کے معززین اور سردار ہونے چاہییں کہ جن کی بیعت سے امام کو قوت و شوکت حاصل ہو اور کسی تنازع کا امکان نہ رہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص جبر و قوت کے ذریعے لوگوں کے نہ چاہنے کے باوجود اپنی حکومت قائم کر لے، کیونکہ جب اسے یہ قدرت حاصل ہو جائے گی کہ وہ اپنے احکام منوا سکے، قوانین جاری کر سکے اور مخالفت کو ختم کر سکے تو گویا اسے حکمرانی کے لیے سارے اسباب میسر آ گئے، لہٰذا اس کی اطاعت واجب اور بغاوت حرام ٹھہری، کیونکہ اس (بغاوت کی) صورت میں خون ریزی کا مفسدہ موجود ہے۔ اس مسئلہ پر تمام امت اسلام کا اجماع و اتفاق ہے۔

سیدنا عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن بعد نمازِ فجر (ایسا) وعظ فرمایا کہ جسے سن کر آنکھیں بہنے لگیں اور دل دہل گئے۔ ایک شخص نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! یہ وعظ تو الوداعی معلوم ہوتا ہے، آپ ہمیں کیا وصیت فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمھیں تقویٰ اور سمع و طاعت کی وصیت کرتا ہوں خواہ تم پر کوئی حبشی غلام ہی حکمران مقرر کر دیا جائے۔ تم میں جو لمبی عمر پائے گا وہ بہت اختلاف دیکھے گا۔ بدعات سے بچ کر رہنا، کیونکہ وہ سراپا گمراہی ہیں۔ تم میں سے جو بھی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو جائے اسے میری اور خلفائے راشدین

کی سنت کو خوب مضبوطی سے تھام لینا چاہیے۔'' [ترمذي : ٢٦٧٦]

مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ اقتدار پر غالب ہو جانے والے مسلم حاکم کی اطاعت واجب اور اس سے قتال و مزاحمت حرام ہو جاتی ہے، خواہ وہ کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کے حکمران کی سمع و طاعت واجب ہے، خواہ وہ صالح ہو یا فاسق و فاجر، جو بھی اقتدار پر فائز ہو گیا اور لوگوں نے اس کی حکومت پر برضا اکٹھ کر لیا، چاہے وہ بزور غالب آیا ہو۔ بہر حال وہ خلیفہ ٹھہرے گا اور بطور امیر المومنین اس کی اطاعت واجب ہوگی۔'' [شرح أصول اعتقاد اهل السنة: ١٦٠/١]

ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''فقہائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سلطانِ متغلب [1] کی اطاعت واجب ہے اور اس کی سربراہی میں جہاد بھی درست ہے اور اس کے خلاف بغاوت سے کہیں بہتر ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، کیونکہ ایسا کرنے سے ہی بڑے نقصان یعنی خون ریزی اور عوامی شورش سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔''

[فتح الباري : ٧/٣]

اس مسئلے میں علمائے اسلام کی عبارات کثرت سے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ شرعی اور عقلی طور پر کسی ایسے شخص کو حاکم تسلیم کرنا جائز نہیں کہ جس کے ہاتھ پر اگرچہ لوگ بیعت تو کر لیں مگر اس کے پاس قوت اور اقتدار نہ ہو۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے ایسے حکمرانوں کی اطاعت کا حکم دیا ہے جو بالفعل موجود اور جانے پہچانے ہوں اور ان کے پاس قوت و شوکت ہو جس کی مدد سے وہ نظام مملکت اور امور سلطنت چلا سکیں، نہ کہ

---

[1] سلطانِ متغلب، ایسے حکمران کو کہتے ہیں جو بزورِ قوت اقتدار پر قابض ہو گیا ہو۔

ایسا نا معلوم اور غیر موجود حاکم کہ جس کے پاس سرے سے کوئی قوتِ نافذہ اور عملی اقتدار موجود ہی نہ ہو۔ درحقیقت کوئی شخص اس وقت تک حکمران کہلا ہی نہیں سکتا جب تک رعایا میں سے معززین اور با اثر لوگ اس کی حمایت و نصرت نہ کریں، کیونکہ حکمرانی کا اصل مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ قوتِ قانون اور ریاستی طاقت کے استعمال سے نظام حکومت چلایا جائے۔ اس لیے جب کسی شخص کو یہ سب کچھ مل جائے تو وہ اس بات کا اہل ہوتا ہے کہ حکومت کرلے اور لوگ اس کی بات سنیں اور فرماں برداری کریں جب تک وہ معصیت الٰہی کا حکم نہ دے۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ حکومت اقتدار اور غلبے کا نام ہے۔ کوئی شخص محض ایک، دو یا چار افراد کی حمایت سے حکمران نہیں بن سکتا جب تک اکثریت اس کی حامی نہ ہو جائے اور یہ حمایت خواہ عوام کی جانب سے رضا کارانہ ہو یا بالجبر انھیں اطاعت پر لایا جائے، بہر حال وہ خلیفہ و امام کہلائے گا اور اس کی اطاعت واجب ہوگی بشرطیکہ وہ طاعتِ الٰہی کا حکم دیتا رہے اور کسی ایسے کھلے کفر کا ارتکاب نہ کرے کہ جس کے کفر ہونے میں شک نہ ہو۔

[منهاج السنة : ١/١١٥]

امام احمد رحمہ اللہ نے یہی لکھا ہے کہ اہل سنت کے عقائد و اصول میں یہ شامل ہے کہ جو ...س اقتدار پر فائز ہو جائے اور لوگ برضا و رغبت اس پر اتفاق کرلیں یا جو شخص بزورِ تلوار ...ران بن بیٹھے اور خلیفہ و امیر المومنین کہلانا شروع کر دے تو اسے زکوٰۃ و عشر دینا اور حاکم ...لیم کرنا جائز ہے خواہ وہ نیک ہو یا بد۔ [منهاج السنة : ١/٥٢٧]

فصل ششم

خوارج کے بارے میں تاریخ کا چلن اور قانونِ فطرت

اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے پر یہ مخفی نہیں ہے کہ حکام و سلاطین کے خلاف اٹھنے والی تحریکیں اور مسلح بغاوتیں کس انجام کو پہنچیں اور اسی طرح یہ بات بھی کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ شریعت نے حکمرانوں کے ظلم و جور پر صبر کی تلقین کیوں کی ہے۔ خروج و بغاوت کے نتیجے میں واقع ہونے والا نقصان اس خرابی سے کہیں بڑھ کر تھا جسے دور کرنے کی غرض سے علم بغاوت بلند کیا گیا۔ کوئی ایک بغاوت اور کوئی ایک مسلح شورش بھی اپنے بدترین عواقب سے خالی نہ رہی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ناقابل ترمیم قانونِ فطری یہی ہے کہ مسلم حکام کے ظلم و زیادتی کو صبر سے برداشت کیا جائے اور ان کے خلاف علانیہ بغاوت سے کنارہ کش رہا جائے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا﴾

[فاطر : ٤٣]

”پس تو نہ کبھی اللہ کے طریقے کو بدل دینے کی کوئی صورت پائے گا اور نہ کبھی اللہ کے طریقے کو پھیر دینے کی کوئی صورت پائے گا۔“

قانونِ الٰہی کبھی نہیں بدلتا اور مثل بھی مشہور ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل سنت کا مشہور مذہب یہی ہے کہ حکام کے جور و جفا کے باوجود ان کے خلاف بغاوت اور ہتھیار اٹھانا جائز نہیں اور احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مسلح بغاوت کے نتیجے میں فتنہ اور قتل و غارت کہیں بڑے پیمانے پر واقع ہوتی ہے بنسبت ظالم حکمرانوں کے ظلم وستم کے۔ لہٰذا ایک چھوٹے فتنہ وفساد کو اس سے بڑے فتنہ وفساد کے ذریعے دور کرنا کیونکر جائز اور قرین عقل ہوسکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں برپا ہونے والی کوئی مسلح بغاوت بھی اس ضرر کثیر سے بچ نہ سکی اور اس سے ہونے والا نقصان ظالم حکام کے مظالم و مفاسد سے بہت بڑھ کر تھا۔

اللہ تعالیٰ نے تو باغیوں سے بھی ابتدائے قتال کا حکم نہیں دیا، جب تک وہ خود لڑائی کا آغاز نہ کریں۔ تو حکام کے خلاف خروج کی ابتدا کیسے جائز ہوسکتی ہے؟

[منهاج السنة : ۳ / ۳۹۱]

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ فَإِنۢ بَغَتۡ إِحۡدَىٰهُمَا عَلَى ٱلۡأُخۡرَىٰ فَقَٰتِلُواْ ٱلَّتِي تَبۡغِي ﴾ [الحجرات : ۹]

''پھر اگر دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے۔''

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

''حاکم وقت کے خلاف اٹھنے والی ہر بغاوت خیر سے کہیں بڑھ کر شر وفساد برآمد کرنے پر منتج ہوئی۔ مثال کے طور پر اہل مدینہ کی یزید بن معاویہ کے خلاف، ابن اشعث کی عراق میں عبد الملک بن مروان کے خلاف، یزید بن مہلب کی عراق ہی میں یزید بن عبد الملک کے خلاف، ابو مسلم خراسانی کی امویوں کے خلاف اور بصرہ و مدینہ میں منصور عباسی کے خلاف برپا ہونے والی مسلح شورشیں لاکھوں مسلمانوں کے قتل اور اموال کی بربادی کا سبب بنیں۔ باغی یا تو مغلوب

ہو کر مارے جاتے ہیں یا غالب و فاتح قرار پاتے ہیں، مگر آخر کار ان کی حکومت کا سورج غروب ہو جاتا ہے اور محض بدنامی ان کے حصے میں آتی ہے۔ عبد اللہ بن علی اور ابو مسلم نے اموی حکومت کے خاتمے اور خلافتِ عباسیہ کے قیام کے لیے بے تحاشا قتل و غارت گری کی اور آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے، مگر انھی کے ہاتھوں قائم ہونے والی عباسی حکومت کے ایک فرماں روا ابو جعفر منصور ہی نے ان دونوں کو قتل کروایا۔ اسی طرح مدینہ میں اہل حرہ، ابن اشعث اور ابن مہلّب وغیرہ سبھی ایک طویل خون ریزی کے بعد شکست سے دو چار ہوئے اور اس طرح نہ تو وہ دین کو فائدہ پہنچا سکے اور نہ ہی ان کی دنیا برباد ہونے سے بچ سکی۔ اللہ تعالیٰ ایسے کسی کام کی ہرگز اجازت نہیں دیتے جس سے دین و دنیا کا کوئی بھلا نہ ہو سکے، خواہ ایسا کام کرنے والے اولیاء اللہ اور متقین ہی کیوں نہ ہوں۔" [منهاج السنة : ٥٢٩/٤]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کسی بھی چھوٹی یا بڑی برائی کے ازالے کی غرض سے ایسا اقدام کرنا جس کے نتیجے میں ایسا شر جنم لے جو اس برائی سے بڑھ کر ہو تو وہ اقدام قطعاً جائز نہیں اور بغاوت تو سب سے آخری حربہ ہے جو بظاہر حکام کے مظالم کے خاتمے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، مگر عملاً وہ بہت بڑے نقصان اور فساد کا سبب بن جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز ضائع کرنے والے حکام کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت مانگی تھی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں، جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔" پھر فرمایا: "جسے اپنے حاکم میں کوئی ناپسندیدہ چیز نظر آئے تو وہ صبر کرے اور اطاعت کا دامن نہ چھوڑے۔"

[إعلام الموقعين : ١٥/٢]

تاریخِ اسلام میں پیش آنے والے فتنہ وفساد کا سبب اسی اصول کو ضائع کر دینے میں

مضمر ہے کہ منکرات پر صبر و استقلال کا دامن چھوڑ دیا گیا۔ برائی کا خاتمہ کرنے کی غرض سے اٹھنے والی ہر تحریک آخر کار بدترین نتائج کا باعث بنی۔



فصل ہفتم

دورِ حاضر میں خروج کی وجوہات

اب جبکہ ہم خوارج کا بیان کر چکے، ان کے قابل مذمت اعمال کا ذکر بھی ہو چکا، ان کی مختلف اقسام بھی بتلا دی گئیں، ان کا شرعی حکم اور فتویٰ بھی پیش کر دیا گیا۔ تو ہمارے لیے ضروری تھا کہ ہم اس ساری بحث کا ثمرہ اور اس کے فوائد بھی بیان کریں کہ جس کے لیے ہم نے یہ کتاب تحریر کی ہے، وہ یہ ہے کہ خوارج کی فکری رفاقت سے گریز اور ان کے طور و اطوار اور منہج سے مکمل پرہیز کیا جائے۔

پہلا سبب:

علماء کی فہم و فراست سے گریز اور اپنی ناقص فہم پر کلی اعتماد۔

ہر فتنہ وخروج میں یہی ایک بنیادی سبب رہا ہے اور یہی بدعت و گمراہی کا اصل منبع ہے۔

ہم ماقبل بحث میں یہ جان چکے ہیں کہ اس اصل ...... یعنی علماء ہی پر اعتماد...... چھوڑ دینے سے، فتنوں اور آزمائشوں میں کس طرح خروج و بغاوت جنم لیتی ہے۔ اس کا آغاز سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت سے ہوا جو وقتاً فوقتاً تا حال جاری ہے۔ یہ سب ہنگامے اپنی فطرت کے اعتبار سے اس صفت میں مشترک ہیں کہ ان میں ہنگامہ بازوں اور فسادیوں نے علماء سے بے اعتنائی کر کے فساد برپا کیا اور اپنے اپنے دور کے قابل اعتماد علماء سے کٹ کر اپنے ناقص علم، کج عقل اور خام جوش و جذبے کی پیروی میں دین کو برباد کر ڈالا۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر چڑھائی کرنے والوں نے بھی اس وقت کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن و تشنیع کر کے اپنی ہی فکر و عقل پر اندھا اعتماد کیا اور آج کے خوارج تو ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے اور انھوں نے علماء کو ہی کافر قرار دے دیا۔ اسی طرح اہل مدینہ نے واقعۂ حرہ میں ابن عمر اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام اور ابن مسیب رحمہ اللہ جیسے تابعین کی نصیحت پر کان نہ دھرے۔ ابن اشعث، ابن مہلب اور ان کے حامیوں نے بھی حسن بصری اور امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہما کے مشورے کو اہمیت نہ دی، جنھوں نے انھیں فتنے سے باز رہنے کو کہا تھا اور بالکل اسی روش پر چلتے ہوئے ہر دور کے خوارج نے علمائے حق سے کنارہ کشی اختیار کیے رکھی۔ لوگ اگر علماء پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی اطاعت کرنے لگ جائیں اور اپنی ناقص فہم پر بھروسا کرنا چھوڑ دیں تو کبھی فساد برپا نہ ہو۔ دراصل یہ وہی ہلاکت خیز مرض ہے جس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرما دی تھی کہ ''آدمی اپنی ہی رائے پر نازاں ہو کر اسی پر چلے گا۔'' [المعجم الأوسط للطبراني : ٤٧/٦، ح : ٥٤٥٢]

دوسرا سبب:

نا اہلوں اور طالب علموں کو مشائخ کے منصب پر فائز کرنا، بڑے بڑے القاب دے کر انھیں علماء و قائدین و پیشواؤں کی صف میں کھڑا کرنا، تاکہ ان کے افکار و فتاویٰ رائج ہو جائیں۔

علمائے راسخین [1] کو متعالمین [2] سے جدا کر کے پہچاننا بہت اہم اور دشوار معاملہ ہے، کیونکہ اس شناخت اور پہچان کے بغیر بہت زیادہ فساد پھیلتا ہے۔ جب نا اہل لوگ فتویٰ دینے لگ جائیں جنھیں عقیدہ و عمل میں منہج سلف کا کچھ پتا نہیں ہوتا تو احکام شریعت بدلنے لگ جاتے ہیں، دین مسمار ہو جاتا ہے اور دین کی خوبیاں اور محاسن ضائع ہوتے ہیں،

---

[1] علمائے راسخین، یعنی علوم دین میں پختہ اور مہارت رکھنے والے علماء۔
[2] متعالمین، یعنی ناقص اور خام علم رکھنے والے، جو عالم ہونے کی غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہوں۔

فتنوں کی بھرمار ہو جاتی ہے اور آتش فساد بھڑک اٹھتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے آج کا پیش منظر ہے۔

آپ ﷺ کا فرمانِ گرامی ہے:

''بے شک اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھالے گا کہ بندوں سے چھین لے، بلکہ علماء کی موت کے ذریعے علم کو ناپید کر دے گا، حتیٰ کہ جب ایک عالم بھی باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو مذہبی پیشوا بنالیں گے، جو علم سے تہی ہونے کے باوجود فتوے دیں گے اور اس طرح خود بھی بھٹکیں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔'' [بخاري : ١٠٠]

عام مسائل جیسے نماز، روزہ اور طہارت وغیرہ کے بجائے مسائل جہاد، صلح اور فتنوں کے بارے میں فتویٰ دینا، بہت مختلف اور علمی گہرائی کا متقاضی ہے۔ ایسے موضوعات پر لب کشائی کرنا اور شرعی حکم صادر کرنا صرف انھی علماء کا حق ہے جو علمی رسوخ کے حامل ہوں اور مصالح و مفاسد [1] کی خوب سوجھ بوجھ رکھتے ہیں اور جنھیں اس بات کا شعور ہو کہ کس موقع و محل پر کون سا شرعی حکم لاگو ہوگا، بلکہ عام مسائل سے بڑھ کر فتنہ و فساد میں اسلامی تعلیمات کو جاننا کہیں زیادہ ضروری ہے۔ اسی لیے امام حسن بصری ؒ فرماتے ہیں:

''فتنے کو آغاز میں صرف عالم ہی پہچان سکتا ہے، مگر جب وہ انتہا کو پہنچتا ہے تو ہر خاص و عام بلکہ جاہل بھی اسے جان جاتا ہے۔''

[الطبقات الكبرىٰ لابن سعد : ١٦٦/٧]

چنانچہ پختہ علم رکھنے والے علماء ان مواقع پر بھی اپنی علمی پختگی اور خداداد بصیرت سے حقیقت کو پا لیتے ہیں، جبکہ عامۃ الناس شکوک و شبہات کی کثرت کی بنا پر الجھ جاتے ہیں اور کسی بھی معاملے کی نوعیت و اصلیت سے بے خبر رہ جاتے ہیں، پروپیگنڈے اور خواہشِ نفس

---

[1] مصالح و مفاسد ان فوائد و نقصانات کو کہا جاتا ہے جو اسلام میں خاص طور پر اہم ہیں اور جن کو حاصل کرنے اور جن سے بچنے کی تدابیر شریعت نے بڑی وضاحت سے بیان کی ہیں۔

کا شکار ہو کر فتنے اور فساد کا ایندھن بن جاتے ہیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''پختہ کار علمائے حق کے سامنے سمندری لہروں کی تعداد میں بھی شکوک وشبہات پیش آ جائیں تو ان کے ایمان و یقین میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ ان کا علم اتنا مستحکم و مضبوط ہوتا ہے کہ وساوس و شبہات ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، بلکہ جب ان (شکوک وشبہات) کی یلغار ہوتی ہے تو ان کا علم و فہم اور بصیرت محافظ بن کر لشکرِ شبہات کو شکست دیتے ہیں۔'' [مفتاح دار السعادة : ١٤٠/٦]

اسی لیے ہر فتنے کے دور میں ایسے ہی علمائے راسخین ثابت قدم رہنے والے ہوتے ہیں اور عام لوگوں کی نسبت تدبر اور بردباری سے کام لے کر راہِ راست کا انتخاب کرتے ہیں۔ گھمبیر معاملات بھی انھیں پھسلا نہیں سکتے اور نہ جذبات ہی انھیں بھٹکا سکتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایسے علماء کو پہچانا جائے اور فتنہ و فساد کے نازک لمحات میں انھی کی راہنمائی میں فکر و عمل کی گمراہی سے بچا جائے۔

رہا یہ سوال کہ ایسے علماء کی علامت و شناخت کیا ہے؟ تو اس کے جواب میں صرف یہی کافی ہے کہ ایسے اہل علم اپنی علمیت و قابلیت میں معروف و مشہور ہوتے ہیں اور انھیں روئے زمین پر خوب قبولیت اور پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔

شیخ حمد بن ناصر بن معمر رحمہ اللہ اہلیت و صلاحیت رکھنے والے عالم کی شرائط میں بیان کرتے ہیں:

''شیخ تقی الدین اور علامہ ابن صلاح نے مفتی ہونے کی یہی بڑی شرط بیان کی ہے کہ وہ علمی قابلیت میں شہرت رکھتا ہو، صرف نام کا عالم نہ ہو اور نہ ہی صرف پڑھنے پڑھانے کی بنا پر عالم کہلاتا ہو۔ خاص طور پر دورِ حاضر میں اس امر کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے کہ آج کل طالب علم اور ناقص العلم افراد بھی مفتی بنے

پھرتے ہیں۔" [الاجتہاد والتقلید]

علماءِ سوء کی پہچان:

اس موقع پر انتہائی ضروری ہے کہ ہم کچھ ایسی علامات ذکر کر دیں جن سے ایسے لوگوں کی پہچان آسان ہو جائے جو علمی گہرائی سے عاری ہیں، مگر انھوں نے علمائے حق کے راستے اور طریقے سے ہٹ کر اپنے آپ کو عالم باور کرا رکھا ہے۔ دراصل انھی لوگوں کی وجہ سے فتنے اور مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ عوام انھیں پہچان کر ان سے بچ سکیں اور اس طرح مصائب کی روک تھام ہو سکے اور ملت اسلامیہ کا بیڑا امن و امان سے پار ہو جائے۔

فتنوں کے زمانے میں نام نہاد علماء کی کئی علامتیں ہوتی ہیں، جن میں سے کچھ پیش خدمت ہیں:

پہلی علامت:

علمائے حق کے مشورے اور اجازت کے بغیر از خود اپنے آپ کو مفتی کے منصب پر فائز کر لینا۔ یہ حرکت دین اسلام میں بڑی دیدہ دلیری پر مبنی ہے، کیونکہ فتویٰ دینا تو بڑا سخت امتحان ہے اور اللہ سے ڈرنے والا شخص حتی الامکان اس سے گریز کرتا ہے چہ جائیکہ فتنوں اور ہنگامی حالات میں فتویٰ بازی کا شوق پورا کرنا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی علمیت اور صالحیت کے باوجود محض خوفِ خدا کی بنا پر فتویٰ دینے سے گریز کرتے تھے۔ علمائے ربانیین کی ہر دور میں یہ عادت رہی ہے اور وہ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان کے بجائے کوئی اور عالم فتویٰ دینے کی ذمہ داری کو پورا کر دے، بلکہ سلف میں سے کچھ علماء تو طلاق اور اس جیسے حساس اور نازک معاملات میں فتویٰ دیتے ہی نہیں تھے، جیسا کہ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کبھی کبھار مسائل طلاق پوچھنے والے سائل کو واپس لوٹا دیا کرتے تھے، یا ابو عبید کے پاس بھیج دیتے اور دریافت فرماتے کہ اس مسئلے کا بہتر جواب کون دے سکتا

ہے؟ جب طلاق جیسے مسائل میں علمائے سلف کی احتیاط کا یہ حال ہے تو خروج و بغاوت اور جنگ و جدال جیسے حساس اور نازک معاملات میں ہر کس و ناکس کو فتویٰ و رائے پیش کرنے کی چھوٹ کیسے دی جا سکتی ہے؟ جبکہ ان مسائل کا تعلق مسلمانوں کے کفر و ایمان اور جان و مال کی حرمت و حلت سے وابستہ ہے۔

فرمان الٰہی ہے:

﴿وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ﴾ [النساء: ۸۳]

''اور جب ان کے پاس امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر وہ اسے رسول کی طرف اور اپنے حکم دینے والوں کی طرف لوٹاتے تو وہ لوگ اسے ضرور جان لیتے جو ان میں سے اس کا اصل مطلب نکالتے ہیں۔''

اب دیکھیے یہ حکم باری تعالیٰ ہے کہ غیر معمولی واقعات و فتن و حوادث میں معاملات کو سمجھنے، پھر ردِّ عمل ظاہر کرنے اور پالیسی بنانے کا اختیار و صواب دید صرف علماء اور حکام کے پاس ہونا چاہیے، نہ کہ طالب علموں، عوام، سیاسی مفکرین اور عقیدہ و عمل میں بدعت کا چلن رکھنے والوں کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ فیصلے کرتے پھریں۔

اس سے پہلے اسی آیت کی تفسیر میں امام سعدی رحمہ اللہ کا قول گزر چکا ہے کہ ''اس آیت میں یہ قانون و ضابطہ بیان ہوا ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں سے کوئی بھی معاملہ درپیش ہو تو اسے اہلیت و صلاحیت والوں کے سامنے ہی پیش کرنا چاہیے، کسی کو حق نہیں کہ وہ خود ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے، کیونکہ یہی طرزِ عمل درستی اور سلامتی سے مناسبت رکھتا ہے اور اس میں غلطی کا امکان نہیں۔'' [تفسير السعدي]

خطیب بغدادی بیان کرتے ہیں:

''ایک شخص ربیعہ رحمہ اللہ کے پاس آیا تو وہ رو رہے تھے، اس نے گھبرا کر رونے کا

سبب دریافت کیا اور کہا کہ آپ پر خدانخواستہ کوئی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے؟"
انھوں نے فرمایا: "نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ اسلام میں ایک بہت بڑا حادثہ رونما ہو گیا ہے مگر اس کے بارے میں فتویٰ ان لوگوں سے پوچھا جا رہا ہے جنھیں اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔ میں اسی صدمے سے رو رہا ہوں۔"

[الفقیہ والمتفقہ، باب القول فیمن تصدّی للفتاوی العامۃ]

خطیب بغدادی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حاکم وقت کو چاہیے کہ وہ اچھی طرح مفتی علماء کی چھان بین کرے اور جو فتویٰ دینے کا اہل ہو اسی کو اس منصب پر لگائے اور جو اہل نا ہو اسے سختی سے فتویٰ دینے سے منع کرے، اگر وہ باز نہ آئے تو اسے سزا دے۔"

تو ثابت ہوا کہ درست معاملہ یہی ہے کہ طلبہ اور کم علم حضرات کو عام مسائل میں بھی فتویٰ بازی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ چہ جائیکہ وہ ہنگامی حالات اور فتنوں میں اکابر علماء کے مشورے واجازت کے بغیر فتویٰ جاری کریں۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ جائز نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی مرضی و پسند سے مسجد میں حدیث پڑھانے اور فتویٰ دینے بیٹھ جائے، بلکہ اسے وہاں کے اہل علم، صاحب الرائے اور دین دار حضرات کے مشورے سے ایسا کرنا چاہیے۔ میں خود مسجد نبوی میں اس وقت تک مسندِ حدیث پر نہیں بیٹھا جب تک علماء و مشائخ میں سے تیس (۳۰) حضرات نے میری اہلیت کی گواہی نہیں دی۔"

امام مالک رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

"میں نے اس وقت تک فتویٰ دینا شروع نہیں کیا جب تک اپنے سے بڑے علماء سے تصدیق نہ کرالی کہ کیا میں فتویٰ دینے کا اہل ہوں؟ میں نے ربیعہ اور یحییٰ

بن سعید رحمہ اللہ سے بھی یہی سوال کیا، تو انھوں نے مجھے اس کی اجازت دے دی۔''

کسی نے امام مالک رحمہ اللہ سے سوال کیا کہ اگر وہ (ربیعہ و یحییٰ) آپ کو روک دیتے تو پھر؟ انھوں نے فرمایا: ''میں یقیناً فتویٰ دینے سے باز رہتا۔ کسی کے شایانِ شان نہیں کہ وہ بڑے علماء سے پوچھے بغیر اپنے آپ کو اس قسم کے علمی منصب کا حق دار سمجھنا شروع کر دے۔ [رواه البيهقي في المدخل، باب التوقي عن الفتيا والتثبت فيها]

امام شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب تک کسی عالم کے فتوے کی دوسرے علماء تائید و تصدیق نہ کر دیں تب تک اس اکیلے کا فتویٰ معتبر نہیں ہوگا اور جب علماء سے تصدیق ہو جائے اور خود اسے بھی پتا چل جائے کہ دوسروں نے میری رائے سے اتفاق کر لیا ہے، تو پھر ہی اس کا فتویٰ قابل عمل ہوگا، ورنہ مشکوک اور متروک قرار پائے گا۔ چنانچہ دیگر علماء کی موافقت کے بغیر تنہا فتویٰ دینا، پھر اس پر اصرار کرنا اور اسے منوانا صرف اسی شخص کا طریقہ ہے جو خود پرست اور خواہش نفس کا اسیر ہو۔'' [الاعتصام، ص: ۷۳۸]

دوسری علامت:

ایسے گروہ کی دوسری نشانی یہ ہے کہ فتنے اور مصائب کے ہنگامی حالات میں وہ معتبر و معتمد علماء کی مخالفت کرتے ہیں۔

صرف فتویٰ بازی ہی نہیں کرتے بلکہ علانیہ مخالفت و عناد پر اتر آتے ہیں، حتیٰ کہ مسلمانوں کو تقسیم کرنے اور ان کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور اس عمل میں وہ معقولیت اور خدا خوفی کی ساری حدیں پھلانگ جاتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل اس بات کی علامت ہے کہ ایسے لوگ بدنیت اور انا پرست ہوتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین تباہ کن عادات میں سے ایک خود پرستی کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ ایک سچے طالب علم اور راست باز عالم کے شایانِ شان یہی ہے کہ وہ حساس اور نازک مسائل

میں اپنے سے بڑے اور معتبر علماء کے علم وفہم سے بے نیاز نہ ہو، بلکہ ان کی علمی بصیرت سے استفادہ کرے۔ تنہا فتویٰ بازی کا بوجھ اپنے سر نہ لے۔ بالکل یہی اصول روایت حدیث میں بھی اپنایا جاتا ہے، جبکہ ایک ثقہ راویٔ حدیث [1] دوسرے ثقہ راویوں کی تائید و موافقت میں حدیث بیان کرے تو اس کی بیان کردہ حدیث قبول کی جاتی ہے، بصورتِ دیگر اس کی حدیث پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ لیکن اگر کوئی ناقص اور خام علم وفہم والا شخص اپنی رائے پر اڑ جائے، بلکہ مناظرہ بازی اور بحث و جدل پر اتر آئے تو جان لینا چاہیے کہ ایسا شخص بدعتی ہے جسے اپنے سوا کسی اور میں علم وانصاف نظر ہی نہیں آتا۔

ایک راست باز طالب علم کا کام یہی ہونا چاہیے کہ وہ اپنی رائے اور علم کو ناقص جانے، جلد بازی اور جذبات میں آ کر محض اپنی تنہا رائے پر فتویٰ دے کر اسے عامة الناس پر مسلط نہ کرے، کیونکہ اس بات کا سخت اندیشہ ہے کہ وہ ابتدا میں معاملے کی حقیقت کو نہ پاسکے، نتائج وعواقب سے غافل رہ جائے اور بعد میں اپنے فتوے پر نادم ہو۔ ایسی صورت میں اسے یہ رعایت بھی نہیں دی جاسکتی کہ اس نے نیک نیتی سے فتویٰ دیا تھا، کیونکہ اس کا غلط فتویٰ امت کو پارہ پارہ کرنے کا اور جانی و مالی نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔

سیدنا سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”اے لوگو! محض عقل پر بھروسا کرتے ہوئے اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو نظر انداز کرتے ہوئے رائے دینا بہت برا عمل ہے، میرے ساتھ یہ قصہ گزرا ہے کہ ابو جندل [2] کے واقعے میں اگر میرے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو

---

[1] ثقہ راوی، اس شخص کو کہا جاتا ہے جو حدیث نبوی بیان کرنے میں سچا اور قابل اعتماد ہو اور فرائض دین کا پابند اور گناہوں سے بچنے والا ہو۔

[2] صلح حدیبیہ کے بعد سیدنا ابو جندل رضی اللہ عنہ کسی تدبیر سے آزاد ہو کر مکہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور مدینہ پہنچ گئے۔ قریش نے معاہدہ کی رو سے انھیں واپس لے جانا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدے کی پاسداری میں انھیں قریش کے حوالے کر دیا۔ یہ اقدام بظاہر حوصلہ شکن اور دینی حمیت کے خلاف تھا، جبکہ حقیقت میں نہایت دانائی اور حکمت پر مبنی تھا۔

ماننے سے انکار ممکن ہوتا تو میں اس دن ضرور حکم عدولی کرتا۔ اس لیے عقل پرستی سے باز رہو۔'' [بخاري : ٤١٨٩]

تیسری علامت:

ہنگامی امور میں زیادہ بیان بازی اور بحث و مباحثہ بھی اس گروہ کی ایک علامت ہے۔ معمولی وقفے کے بعد بار بار بیانات دینا اور اپنے جیسے دوسروں کو بھی اس میں شریک کر لینا، ان لوگوں کا معمول ہے۔ اگر یہ تمام بیانات جمع کر لیے جائیں تو ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہو جائے۔ یہ کثرتِ کلام انتشار و لاقانونیت کو جنم دیتی ہے۔ ہر پیش آنے والی مصیبت ایسی نہیں ہوتی کہ اس پر تبصرے کیے جائیں اور بیان بازی کی محفل سجائی جائے، بلکہ مناسب یہ ہوتا ہے کہ مختصر اور واضح انداز میں اس مصیبت کی روک تھام اور اس سے نمٹنے کا طریقہ بتایا جائے جسے ہر کوئی سمجھ سکے۔ زیادہ زبان چلانا، مباحثہ بازی کرنا اور مناظرہ کرنا بہر حال اہل بدعت کا شیوہ ہے۔

حماد بن زید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ عمرو بن عبید اور شبیب بن شیبہ ساری رات کسی موضوع پر بحث کرتے رہے حتیٰ کہ صبح ہو گئی، نماز فجر پڑھ کر عمرو بن عبید پھر شبیب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ آؤ دوبارہ بات کرو تو حماد رحمہ اللہ نے فرمایا: '' جب کسی شخص کا یہ حال دیکھو کہ وہ ہر وقت ہر کسی سے مسائل میں بحث و جدل پر تیار رہتا ہے اور کبھی اپنا موقف بدلنے پر یا بحث سے باز آنے پر آمادہ نہیں ہوتا تو یقین کر لو کہ وہ کج فکر اور الٹی کھوپڑی کا مالک ہے اور اس سے گفتگو سے پرہیز کرو۔''

[الاعتصام : ٧٤٠]

اسی لیے سلف صالحین کثرتِ کلام اور مسائل میں بحث بازی سے منع کیا کرتے تھے، کیونکہ اہل حق کے لیے تو سچائی ہمیشہ واضح ہوا کرتی ہے۔ اس لیے انھیں بحث کی ضرورت

ہی نہیں ہوتی، جبکہ کج دماغوں کو شکوک وشبہات اٹھانے کی عادت ہوتی ہے اور وہ بحث و مباحثہ سے ان کا حل ڈھونڈتے ہیں، حالانکہ متشابہ [1] کے بارے میں تسلی بخش جواب ممکن ہی نہیں ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''علم وحکمت ایک ایسی روشنی ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ جسے چاہے راہ دکھا دیتا ہے اور یہ (راہ پالینا) زیادہ سوال و جواب سے حاصل نہیں ہوتا۔''

[جامع بيان العلم و فضله، لابن عبد البر، باب معرفة أصول العلم و حقيقته]

شیخ بربہاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ تم پر رحمت فرمائے، یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ علم زیادہ باتیں کرنے اور کتاب بینی سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ عالم تو وہ بنتا ہے جو قرآن وسنت کی پیروی کرے، خواہ اس نے کتابیں کم پڑھی ہوں اور اس کا علم بھی محدود ہو، تو جو قرآن وسنت کی مخالفت کرے وہ بدعتی ہے، اگرچہ اس کا علم اور کتب بینی بہت وسیع ہو۔''

[شرح السنة : ۱۰۲]

ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''دورِ اوّل کے بعد آنے والے علماء میں یہ فتنہ بہت پھیلا، یعنی مسائل میں بحث کرنا، الجھنا اور مناظرہ بازی کرنا۔ ایسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص جتنا زیادہ گفتگو کرنے والا اور بحث میں غالب آنے والا ہوگا وہ اتنا ہی بڑا عالم سمجھا جائے گا اور جو ایسا زبان آور اور علمی جھگڑالو نہیں ہوگا وہ علمی طور پر کم تر ہوگا، حالانکہ ایسا خیال کرنا صرف حماقت و جہالت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں غور کر کے دیکھ لیں کہ سیدنا ابوبکر، عمر، عثمان، علی، عبد اللہ بن مسعود اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا کلام سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کم ہے، مگر وہ سب اس

---

[1] متشابہ ان امور کو کہتے ہیں جن کو بذریعہ عقل وفکر نہ جانا جا سکے، جیسے اللہ تعالیٰ کی صفات سمیع، بصیر وغیرہ کہ ہم محض گمان سے اس کے سننے اور دیکھنے کی کیفیت کو کبھی نہیں جان سکتے۔ صرف بن دیکھے ایمان لائیں گے۔

کے باوجود علم میں ان سے فائق و برتر تھے۔ اسی طرح تابعین عظام کا کلام صحابہ رضی اللہ عنہم کے کلام سے کہیں زیادہ ہے، حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین رحمہم اللہ سے زیادہ عالم تھے۔ اسی طرح تبع تابعین کا کلام، تابعین سے بڑھا ہوا ہے باوجود اس کے کہ تابعین ان سے بڑے عالم تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ علم کو پڑھنا اور بیان کرنا ہی عالم ہونے کی پہچان نہیں ہے، بلکہ یہ تو ایسا نور ہے جو اللہ کی رحمت سے دل میں ڈالا جاتا ہے اور اس کی برکت ہی ایک سے عالم دین حق کو پہچانتا ہے اور بامقصد اور مختصر گفتگو سے اس علم کو بیان کردیتا ہے۔

[بيان فضل علم السلف على علم الخلف: ٥٧]

چوتھی علامت:

ایسے گروہ کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ کسی بھی واقعے کی تصدیق اور اس کے زمینی حقائق جانے بغیر اس کے بارے میں جلد بازی سے بیان دے دینا اور اپنا موقف پیش کردینا۔ آپ نے ضرور یہ مشاہدہ کیا ہوگا کہ کوئی بھی ناگہانی واقعہ یا سانحہ پیش آجائے تو ایسے افراد ٹی وی چینلز، انٹرنیٹ یا دیگر مواصلاتی و اطلاعاتی وسائل کے ذریعے تبصرہ بازی شروع کر دیتے ہیں اور تنقید و تبصروں، فتووں اور تجاویز کی بھرمار کردیتے ہیں اور یہ سب کچھ آناً فاناً ہو جاتا ہے، جبکہ مناسب یہی ہوتا ہے کہ صورت حال کو واضح ہونے دیا جائے، پھر اچھی طرح حقیقتِ حال کو سمجھا جائے اور اس واقعے کے مخصوص زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر سنجیدہ اور پائیدار حل پیش کیا جائے۔

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِۦ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنۢبِطُونَهُۥ مِنْهُمْ﴾ [النساء: ٨٣]

"اور جب ان کے پاس امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے اسے مشہور کردیتے ہیں اور اگر وہ اسے رسول کی طرف اور اپنے حکم دینے والوں کی طرف لوٹاتے تو

وہ لوگ اسے ضرور جان لیتے جو ان میں سے اس کا اصل مطلب نکالتے ہیں۔"

امام سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس آیت میں مختلف معاملات کی خبر سنتے ہی اسے پھیلا دینے سے منع کیا گیا ہے اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ کسی بھی معاملے میں زبان کھولنے سے پہلے غور وفکر اور تدبر سے کام لیا کرو کہ اس بارے میں خاموشی بہتر ہے، یا بات کرنا زیادہ مفید ہے، پھر خاموش رہنے میں خیر ہو تو خاموش رہا جائے اور اگر اسے ذکر کرنے میں مصلحت و فائدہ ہو تو بیان کر دیا جائے۔" [تفسير السعدي : ١٩٠/١]

علم میں پختگی اور ثقاہت رکھنے والے اہل علم کا یہی شیوہ ہے کہ وہ ٹھہراؤ سے کام لیتے ہیں اور جلد بازی سے بچتے ہیں۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جنھوں نے فتویٰ اور رائے پیش کرنے میں جلد بازی کی اور بعد میں پتا چلا کہ حقیقتِ معاملہ کچھ اور تھی، جو کچھ بیان ہوا اور پیش کیا گیا درست نہیں تھا، اس معاملے کے کچھ پہلو اور زاویے اور بھی تھے، تو ایسے حضرات کو ندامت اٹھانا پڑی اور لوگوں کے نزدیک ان کا علمی وقار اور دینی مرتبہ مجروح ہو گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس معاملے میں بھی رفق (ٹھہراؤ اور متانت) شامل ہو جائے وہ خوش نما ہو جاتا ہے اور جس معاملے سے بھی وہ (رفق) نکل جائے وہ معیوب (بدنما) ہو جاتا ہے۔" [مسلم : ٢٥٩٤]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عبد القیس کے وفد میں آنے والے ایک شخص کی تعریف بھی اسی بنا پر فرمائی کہ تم میں دو عادتیں ایسی ہیں جو اللہ کو پسند ہیں، بردباری اور ٹھہراؤ۔ [مسلم : ١٧]

شرعی اور عقلی قانون و اصول بھی یہی کہتے ہیں کہ کسی بھی چیز کے متعلق فیصلہ اس چیز کی حقیقی صورت و شکل ہی سے جان لینا چاہیے، تب ہی وہ مبنی بر عدل و انصاف ہو گا۔

جب راسخ علمائے کرام [1] کسی امر کے بارے خاموش رہیں تو ان سے کم تر اہل علم کو تو بہر حال خاموش ہی رہنا چاہیے، کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ کب بولنا چاہیے، کیا کہنا چاہیے اور کس موقع پر خاموشی بہتر ہے۔ لہذا طالب علم کو بھی اسی محدود دائرے میں اپنے آپ کو پابند کرنا چاہیے۔

پانچویں علامت:

ایسے لوگ بڑے بڑے القاب پسند کرتے ہیں، مثلاً علامہ، محدث اور امام وغیرہ، حالانکہ یہ الفاظ اپنے معانی کے اعتبار سے صرف انھی اشخاص پر صادق آتے ہیں جن میں وہ صفات پائی جائیں، جبکہ مخلص اہل علم و صالحین ہمیشہ کسر نفسی سے کام لیتے ہیں اور اپنے آپ کو بھاری بھرکم القاب کا مستحق نہیں سمجھتے، بلکہ جیسے جیسے ان کا علم بڑھتا جاتا ہے ان کی تواضع میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اپنے علم کے مقابلے میں وہ اپنی لاعلمی کو پیش نظر رکھتے ہیں، سلف صالحین کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے یہ چیز واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ مگر اہل بدعت کا چلن ہمیشہ یہی رہا ہے کہ اپنے لیے پر تکلف اور تصنع سے لبریز القاب کو پسند کرتے ہیں، تاکہ ان کا کھوٹا علمی سرمایہ اور باطل افکار لوگوں کے ہاں مقبول ہو سکیں۔

امام شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اہل بدعت کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ وہ سلف میں سے ایسے علماء کی مذمت کرتے ہیں جو اپنے علم و فضل میں معروف و مشہور تھے اور ان کے ایسے مخالفین کی مدح سرائی کریں گے جو علمی پائے میں ان سے کم تر ہوں۔ دراصل یہ خصلتِ بد خوارج سے شروع ہوئی ہے، جب انھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بدگوئی کی اور انھیں کافر ٹھہرایا۔ حالانکہ ان کے بے شمار فضائل و مناقب خود

---

[1] پختہ علمائے کرام۔

زبانِ رسالت سے بیان ہوئے ہیں اور ان کے قاتل عبد الرحمن بن ملجم لعین کی تعریف کرتے ہیں، جبکہ سلف نے بالاتفاق اس کی مذمت کی ہے۔ لہٰذا آپ جب بھی کسی کو اس راہ پر چلتا دیکھیں تو سمجھ لیں کہ یہ شخص گمراہ فکر ہے۔''

[الاعتصام : ٧٤٠]

میں انہی علامات پر اکتفا کرتا ہوں کہ اگر ان کی روشنی میں افراد کو پرکھا جائے تو آسانی سے راہِ راست سے بھٹکنے والے عناصر کو پہچانا جا سکتا ہے، دورِ حاضر میں خاص طور پر اس کی ضرورت بڑھ گئی ہے کہ علم میں ناقص اور نا اہل لوگوں کو رہبری کے منصب پر فائز کر دیا جاتا ہے جو دینی و دنیاوی دونوں اعتبار سے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔

تیسرا سبب:

حکمرانوں پر سرِ عام تنقید و تشنیع

اسلامی معاشرے کی بقا و حیات کا دار و مدار دو مرکزی ستونوں پر ہے:

① اللہ اور رسول ﷺ کی فرماں برداری کرنا۔

② علماء و حکام کی اطاعت کرنا۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾

[النساء : ٥٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ تم میں تین خصلتیں پسند کرتا ہے اور تین ناپسند کرتا ہے۔ پسندیدہ خصلتیں یہ ہیں کہ اسی کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، سب مل کر اللہ کی رسی (اسلام) کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ بازی سے بچو اور ناپسندیدہ صفات یہ ہیں:

”قیل وقال ❶، کثرتِ سوال اور مال کو ضائع کرنا۔“ [مسلم : ۱۷۱۵]

امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الموطا میں پسندیدہ خصلتوں میں یہ چیز بھی بیان کی ہے کہ اپنے حکمرانوں کی خیر خواہی کرنا اور ان کا بھلا چاہنا۔ [الموطأ : ۱۷۹٦]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا:

”کسی مخلص مسلمان کا دل ان تین چیزوں کے بارے میں خیانت اور بغض و کینہ کا شکار نہیں ہو سکتا۔ ① ہر نیکی خالص اللہ ہی کے لیے کرنا۔ ② مسلمان حکمرانوں کی ہمدردی اور خیر خواہی کرنا۔ ③ مسلمانوں کی جمعیت سے جڑ کر رہنا (تفرقے سے بچنا)۔“

[ترمذي : ۲٦۵۸]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اس حدیث میں تین عظیم الشان خوبیوں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے: ① اللہ کی خوشنودی کے لیے ہی کوئی کام کرنا۔ ② اہل اقتدار کی خیر خواہی کرنا۔ ③ اور مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ مل کر رہنا اور تفرقے سے بچنا۔

دراصل ان تینوں اصولوں نے دین کے تمام قواعد و ضوابط کو اپنے اندر اکٹھا کر رکھا ہے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کو اپنے میں جمع کر لیا ہے اور دنیا و آخرت کے فوائد و منافع کو حسن تدبیر کے ساتھ ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ حقوق کی مشہور دو ہی اقسام ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق یہ ہیں کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک و ہم سر نہ ٹھہرایا جائے، یہی اخلاصِ عمل کا مفہوم ہے اور حقوق العباد کی دو قسمیں ہیں۔ ① خاص اور ② عام۔

خاص حقوق میں والدین، میاں بیوی اور پڑوسی وغیرہ کے حقوق شامل ہیں۔ یہ دین کے فروعی معاملات ہیں، کیونکہ انسان کبھی کبھار ان حقوق کے بارے سبک دوش بھی ہو جاتا

---

❶ قیل وقال اور کثرتِ سوال کا معنی یہ ہے کہ بلاضرورت بحث و مباحثہ میں مشغول ہونا اور مفروضے قائم کر کے سوالات پیدا کرنا اور ان کے جوابات ڈھونڈنے میں خواہ مخواہ تکلف سے کام لینا۔

ہے اور اس میں تمام تر حکمت و مصلحت انفرادی ہوتی ہے۔

عام حقوق بھی دو طرح کے ہیں: حکمرانوں کے اور رعایا کے، حکمرانوں کے حقوق یہ ہیں کہ ان کی خیر خواہی کی جائے، ان کا بھلا سوچا جائے، ان کی بدنامی اور ان کے خلاف فتنہ و فساد پھیلانے سے باز رہا جائے۔ رعایا کے حقوق یہ ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر رہا جائے، کیونکہ عوام الناس کے مفادات اور ضروریات باہم مل کر رہنے سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ مل جل کر رہنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوں گے، بلکہ اگر ایک بڑی تعداد بھٹک بھی جائے تو بہر حال ایک قلیل گروہ انھیں منع کرنے والا بھی باقی رہے گا۔" [مجموع الفتاوی: ۱۸/۱]

مختصر یہ کہ اجتماعیت سے دین و دنیا کی بہت سی بھلائیاں اور فوائد حاصل ہوتے ہیں، جو انفرادیت اور علیحدگی میں مفقود ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر یہ بات اظہر من الشمس مسلّم ہو گئی کہ حکمرانوں پر اعتراض و تنقید سے ہمیشہ معاشرتی تفرقہ پیدا ہوتا ہے اور عوام کے دلوں میں ان کے لیے نفرت جنم لیتی ہے، جو رفتہ رفتہ بغاوت و نافرمانی میں بدل جاتی ہے، جس سے بدامنی اور قتل و غارت تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ نتائج میں انتشار اور مال و جان کے عظیم نقصان کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ابو سہل محمد بن عبد اللہ تستری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لوگ جب تک اپنے حاکم اور علماء کی تعظیم بجا لاتے رہیں گے خیر و برکت میں رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی دنیا و آخرت سنوار دیں گے اور اگر ان دونوں کی تحقیر و تذلیل کی تو گویا انھوں نے اپنی دنیا و آخرت کو برباد کر ڈالا۔"

[تفسیر القرطبي: ۲٦٠/٥]

مزید فرماتے ہیں:

"اس امت کے تہتر فرقے ہوں گے جن میں سے بہتر بربادی و ہلاکت سے دو چار ہوں گے جو سب کے سب حکمرانوں سے بغض رکھنے والے ہوں گے اور

نجات سے ہم کنار ہونے والا گروہ وہی ہوگا جو حکومت کا حامی و مددگار ہوگا۔''

[قوت القلوب، لأبي طالب المكي: ٢/٢٠٩]

امام بربہاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب تم کسی کو حکومت کے خلاف بددعا کرتے دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ بدعتی ہے اور اگر کوئی اس کے حق میں دعائے خیر کرنے والا ہو تو یقیناً وہ سنت کا پیروکار ہے۔''

[شرح السنة: ١١٣]

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سلف صالحین کے منہج کو سمجھنے میں بہت خدا خوفی کی ضرورت ہے کہ وہ حاکم وقت کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے تھے، ان کی کوتاہیوں پر فتنہ بھڑکانے سے کس طرح گریز کرتے تھے اور ان کے خلاف نفرت انگیزی سے کس قدر اجتناب کرتے تھے، کیونکہ ایسا طرزِ عمل فتنے کی اصل جڑ ہے جس سے عوام الناس میں فساد برپا ہوتا ہے۔ حکام کے خلاف نفرت بھڑکانے سے انارکی اور بدامنی پیدا ہوتی ہے، جبکہ علماء کے بارے میں منفی پروپیگنڈے سے ان کے متعلق بیزاری جنم لیتی ہے، جو بالآخر دین وشریعت سے لاتعلقی تک لے جاتی ہے۔ لہٰذا جب کسی نے علماء و حکام کی عزت و وقار گھٹانے کا ارتکاب کیا تو یقیناً اس سے شریعت و امن عامہ خطرے میں پڑ گئے، کیونکہ اہل علم پر زبان درازی سے ان پر اعتماد ختم ہو جائے گا اور اہل اقتدار پر نقد و جرح سے ان کی سمع وطاعت باقی نہیں رہ سکے گی اور شر و فساد بھڑک اٹھے گا۔ اس لیے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم حکام کے ساتھ معاملات کے باب میں سلف صالحین کی روش پر قائم رہیں اور بدانجامی سے بچنے کے لیے اپنے آپ پر قابو رکھیں، کیونکہ تحریک اٹھانے اور بے چینی پھیلانے میں سب سے پہلا فائدہ دشمنوں کو حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا بھڑکاؤ سے بچنا اور ضبط و متانت کا دامن تھامے رکھنا ہی حکمت کا تقاضا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خطاؤں اور خرابیوں پر بالکل خاموشی اختیار کی جائے، بلکہ اس انداز

سے اصلاح وسنوار کی حتی الامکان کوشش کی جائے کہ باقی سب کچھ اپنی جگہ برقرار رہے، مگر خرابی باقی نہ رہ سکے۔ حقیقی اصلاح یہی ہے کہ نظام اور حکومت بدلے بغیر صرف حالات کو درست کیا جائے۔'' [رسالة "حقوق الراعي والرعية"]

حکمرانوں کو نصیحت کرنے اور ان کی خیر خواہی کا طریقہ سنت میں صاف صاف موجود ہے کہ یہ صرف ناصح اور حاکم کے مابین ہی ہونا چاہیے۔ فرمانِ نبوی ﷺ ہے:

''جو کوئی حاکمِ وقت کو نصیحت کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ تنہائی میں اس کا ہاتھ تھام کر (اپنائیت کے ساتھ) اسے فہمائش کرے، علانیہ سب کے سامنے اسے شرمندہ نہ کرے۔ اگر اس نے نصیحت قبول کر لی تو مقصد پورا ہو گیا اور اگر تسلیم نہ کی تو بہر حال ناصح نے اپنا فرض پورا کر دیا۔''

[مسند أحمد: ٣/٤٥٣، ح: ١٥٣٦٩]

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے فرمایا:

''ایک شخص نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ میں اپنے حاکم کو نیکی کا حکم دوں؟ تو آپ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اگر تجھے خطرہ ہو کہ وہ تجھے قتل کروا دے گا تو پھر ایسا نہ کر اور اگر تو نے ضرور ایسا کرنا ہی ہو تو پھر اس طرح سے کر کہ تیرے اور اس کے علاوہ کسی تیسرے کو کانوں کان خبر نہ ہو۔''

[مصنف ابن أبي شيبة: ١٥/٧٤]

ابن نحاس رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حاکم کو تنہائی میں نصیحت کرنا بہت ہی اچھا ہے بنسبت اس کے کہ سرعام اسے شرمندہ کیا جائے، بلکہ پند ونصیحت ہے ہی وہی جو محبت کے ساتھ خفیہ طور پر کسی تیسرے کی موجودگی کے بغیر کی جائے۔'' [تنبيه الغافلين: ٦٤]

شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سلف صالحین کا قطعاً یہ شیوہ نہیں تھا کہ حکمرانوں کے عیوب کی تشہیر کریں اور

منبر و مسجد میں علانیہ اسے بیان کریں، کیونکہ اس سے انقلاب پیدا ہوتے ہیں اور حکام و عوام کے مابین سمع و طاعت کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، حالانکہ یہ شرعی فریضہ ہے، پھر آخر کار اس کا نتیجہ بغاوت کی صورت میں نکلتا ہے جس سے کوئی خیر اور کوئی نفع برآمد نہیں ہوتا۔ بلکہ سلف کا طریقہ صرف یہی ہے کہ عوام اور حکمران کے درمیان صرف نصیحت اور خیر خواہی کا تعلق رہے، خواہ بالمشافہ نصیحت کی جائے، یا انھیں خط لکھ کر، یا علماء کے ذریعے ان تک اپنی تجویز اور ناصحانہ مشورہ پہنچایا جائے۔ اسی طرح برائی کا ذکر اور اس کی مذمت بھی اس کے فاعل کے بغیر ہی ہونی چاہیے۔ بدکاری، شراب اور سود وغیرہ کی برائی بیان کی جائے، مگر اس کے مرتکب کا نام نہ لیا جائے، چاہے وہ (برائی کرنے والا) حاکم ہو یا عوام۔"

[مجموع فتاوى ابن باز : ٨/ ٢١٠]



فصل ہشتم

طریقۂ سلف سے ہٹ کر جماعت سازی

قرآن کریم کے مطابق جماعت بندی ممدوح بھی ہے اور مذموم بھی۔[1] ممدوح جماعت بندی وہ ہے جس سے مسلمانوں اور ان کے حکام کی بھلائی اور فلاح و بہبود مقصود ہو اور اس کا طریقہ اسلاف سے لیا گیا ہو، اس میں کسی مخالفت و عداوت کا مقصد پنہاں نہ ہو۔ یہی وہ جماعت سازی ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں، قرآن کریم میں دو مقام پر اس کا ذکر آیا ہے:

﴿وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾

[المائدة: ٥٦]

''اور جو کوئی اللہ کو اور اس کے رسول کو اور ان لوگوں کو دوست بنائے جو ایمان لائے ہیں تو یقیناً اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو غالب ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ

---

[1] ممدوح قابل تعریف اور مستحسن چیز کو کہتے ہیں، جبکہ مذموم قابل مذمت اور بری شے کو کہا جاتا ہے۔

حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [المجادلة : ٢٢]

”تو ان لوگوں کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہیں پائے گا کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی، یا ان کا خاندان۔ یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اس نے ایمان لکھ دیا ہے اور انھیں اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ قوت بخشی ہے اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔ یہ لوگ اللہ کا گروہ ہیں، یاد رکھو! یقیناً اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں۔“

پہلی آیت اہل ایمان کے ساتھ محبت اور دوستی کا مفہوم رکھتی ہے، جبکہ دوسری آیت اہل کفر کے ساتھ نفرت و عداوت سے متعلق ہے۔

جماعت سازی کی وہ قسم جو مذموم اور ناپسندیدہ ہے، اس کی دو قسمیں ہیں:

① جماعت مسلمین اور امامِ مسلمین کے علاوہ کسی اور کے لیے جماعت بنانا، مثلاً لسانی، قومی یا وطنی بنیاد پر اکٹھا ہونا اور گروہ بندی کرنا۔

② جماعت تو اہل اسلام ہی کے لیے بنائی جائے، مگر اس کی تشکیل قرآن و سنت اور سلف صالحین کے منہج کے مطابق نہ ہو، جیسے کوئی ایسی پارٹی بنا لے جس کو عام مسلمانوں اور حکام سے کاٹ کر علیحدہ کر دے اور انھیں کسی اور سے کوئی سروکار نہ ہو اور حکام کی اطاعت کے بجائے صرف پارٹی لیڈر ہی کا حکم چلتا ہو اور پارٹی ممبر صرف اسی کی سمع و طاعت کے پابند ہوں۔

یا یہ کہ پارٹی کی تشکیل صرف شخصیات کی بنیاد پر ہو اور ممبران کی آراء پر ہی ان کے معاملات چلائے جائیں، اکثریت و اقلیت کی بنیاد پر فیصلے ہوں اور کتاب و سنت اور اسلاف

کو کوئی حیثیت حاصل نہ ہو۔

اس قسم کی جماعت سازی کی مذمت قرآن کریم میں کئی مقامات پر بیان ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَتَقَطَّعُوٓا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۖ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ﴾

[المؤمنون : ۵۳]

''پھر وہ اپنے معاملے میں آپس میں کئی گروہ ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ہر گروہ کے لوگ اسی پر، بہت خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ﴾

[الروم : ۳۱، ۳۲]

''اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں سے نہ ہو جاؤ۔ ان لوگوں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کئی گروہ ہو گئے، ہر گروہ اسی پر جو ان کے پاس ہے، خوش ہیں۔''

معلوم ہوا کہ اپنی خواہشات اور بدعات و ایجادات کی بنیاد پر جماعتیں بنانا اور کتاب و سنت سے صرفِ نظر کر کے محض شخصیات اور نسلی و قومی اساس پر پارٹیاں قائم کرنا ہی انتشار و اختلاف اور فتنوں کا اصل سبب ہے۔ وہ لوگ جو کوئی پارٹی بنائیں اور درست و غلط ہر طریقے سے اس کی حمایت و امداد کرنے لگیں اور اپنی ساری جد و جہد اسی کی طرف بلانے اور دعوت دینے میں صرف کر دیں، خواہ دلیل کے اعتبار سے وہ غلط ہوں اور پارٹی سے تعلق اور عدم تعلق کی بنا پر ہی دوستی اور دشمنی کا رشتہ قائم کریں، در حقیقت یہ لوگ جماعتِ مسلمین سے خارج ہیں۔

ایمان ہی کی بنیاد پر، ایمان ہی کی شرط پر، صرف اہل ایمان سے محبت کرنا ہی اصل فریضۂ ایمان ہے، قطع نظر اس کے کہ ان کا تعلق کس علاقے، رنگ اور زبان سے ہے، یا وہ کس تنظیم و گروہ سے منسلک ہیں، محض ایمان کی بنیاد پر محبت کا تعلق استوار کرنا مطلوبِ ایمان ہے۔

فرمان الٰہی ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات : ١٣]

"بے شک تم میں سب سے عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔"

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مختلف جماعتوں، اشخاص اور گروہوں کی طرف منسوب ہونا اور انھی سے محبت و اطاعت کا تعلق قائم رکھنا امتِ اسلام کے ٹکڑے کرنے کے مترادف ہے اور اس طرح جماعت منتشر ہوتی اور فرقہ بازی بڑھتی ہے، یہ اہل بدعت کا شیوہ ہے اور اس طرح سنت سے بیزاری پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ ممنوع ہے اور ایسا کرنے والا گناہ گار ٹھہرے گا۔" [مجموع الفتاوى : ١١/ ٥١٤]

شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جب کبھی جہاں بھی کوئی فردِ واحد یا جماعت کتاب وسنت کی طرف بلائے اور توحید و اتباعِ شریعت کی دعوت پیش کرے تو سمجھ لو کہ یہی جماعتِ اسلام ہے اور یہی لوگ فرقۂ ناجیہ [1] میں سے ہیں۔ رہی بات ان لوگوں کی جو قرآن و حدیث کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف بلائیں تو جان لو کہ یہ جماعتِ مسلمین میں سے نہیں، بلکہ گمراہ اور تباہ ہونے والی جماعت میں سے ہیں۔ فرقۂ ناجیہ وہی لوگ ہیں

---

[1] فرقہ ناجیہ کا لفظی معنی ہے "نجات پانے والی جماعت۔" دراصل یہ جماعت قیامت کے قریب والے تہتر فرقوں میں سے وہ واحد جماعت ہے جس کی اخروی نجات کی خبر آپ ﷺ نے دی تھی۔

جو کتاب اللہ و سنت رسول ﷺ کی دعوت پیش کریں، خواہ ان میں سے کچھ لوگ یہاں اور کچھ وہاں، پوری روئے زمین پر مختلف اطراف میں بکھرے ہوئے ہوں، عقیدہ کی وحدت کی بنیاد پر یہ سب ایک جماعت ہیں۔''

ایک سوال کے جواب میں شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہاں! اسلام میں اصل اور برحق جماعت وہی ہے جس سے منسوب ہونا اور جڑنا واجب ہے، رہی بات گروہ بندی کرنے والی جماعتوں کی جو اپنی رائے کی ہی تائید چاہتی ہیں خواہ حق ہو یا باطل تو ایسی جماعتوں سے منسوب ہونا جائز نہیں کیونکہ ایسا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اصل اور برحق جماعت سے نفرت اور علیحدگی ہوگئی اور گروہ پرست جماعت سے محبت اور دوستی کا رشتہ قائم ہوگیا۔''

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾ [الأنعام: ۱۵۹]

''بے شک وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر لیا اور کئی گروہ بن گئے، تو کسی چیز میں بھی ان سے نہیں، ان کا معاملہ تو اللہ ہی کے حوالے ہے، پھر وہ انھیں بتائے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ۖ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ﴾

[الشورى: ۱۳]

''اس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جس کا تاکیدی حکم اس نے نوح کو دیا اور جس کی وحی ہم نے تیری طرف کی اور جس کا تاکیدی حکم ہم نے

ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا، یہ کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں جدا جدا نہ ہو جاؤ۔''

اور فرمایا:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ [آل عمران: ۱۰۵]

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو الگ الگ ہو گئے اور ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح احکام آ چکے اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

آپ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے مزید ارشاد فرمایا:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ [المائدۃ: ۲]

''اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔''

یہ تمام جماعتیں، جو اسلام کی نسبت سے اسلامی کہلاتی اور اسلام کی خدمت کا دعویٰ کرتی ہیں، اگر اپنے دعوے میں سچی ہیں تو ان کا فرض ہے کہ فرقہ بازی چھوڑ کر ایک ہو جائیں اور وہ جماعت بن جائیں، جس کے برحق اور سچا ہونے کی پیشین گوئی آپ ﷺ نے فرمائی تھی کہ ''میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی اور ایک جماعت کے سوا باقی سب جہنم میں جائیں گے۔'' آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ ایک جماعت کون سی ہو گی؟ تو فرمایا: ''وہ لوگ جو میرے اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے راستے پر گامزن رہیں گے۔''

مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو جانے کے باوجود تمام اہل اسلام کا یہ فرض ہے کہ بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور جماعتی تعصب اس سلسلے میں آڑے نہ آنے دیں، کم از کم توحید و سنت اور منہج سلف صالحین کا نام لینے والوں کا یہ خاص طور پر

فرض بنتا ہے کہ وہ عقیدۂ توحید کی دعوت دینے میں ایک دوسرے کے دست و بازو بن کر دین کا کام کریں اور جملہ اسلامی و انسانی خدمات میں، جیسے تعلیم وتدریس، دعوت وتبلیغ، مصیبت زدگان اور فقراء کی امداد اور مساجد و مدارس کی تعمیر وتاسیس میں باہمی تعاون کی راہ اختیار کریں۔ جبکہ اس کے الٹ بدی و نافرمانی کے کاموں پر تعاون سے منع فرمایا ہے، فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾

[المائدة : ٢]

''اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔''

نیکی خیر خواہی میں تعاونِ باہمی کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں صرف اللہ کی خوشنودی پیش نظر ہو نہ کہ اپنی جماعت کی سربلندی اور دوسری شرط یہ ہے کہ اس طرح کی جماعت سازی میں حکامِ وقت سے بغاوت و نافرمانی اور اہل اسلام کو تقسیم کرنے کا کوئی عنصر نہ پایا جاتا ہو۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جماعت سازی کر کے ایک پارٹی اور گروہ بن جانے والے اگر اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پر بلاکم وکاست قائم ہیں تو وہ مومنین ہیں، ان کے حقوق اہل ایمان کے حقوق جیسے اور ان کی ذمہ داری بھی اہل ایمان کی ذمہ داری جیسی ہوگی، لیکن اگر انھوں نے قرآن وسنت کی بیان کردہ حدود سے تجاوز کر کے کچھ اور بھی اپنی جماعت میں شامل کر لیا مثلاً اپنی پارٹی میں داخل ہونے والے کی جائز و ناجائز حمایت اور پشت پناہی کی اور دوسرے لوگوں سے غیریت برتی اور ان کی جائز امداد بھی نہ کی تو بلاشبہ یہ وہ دھڑے بندی اور فرقہ پرستی ہے جس کی مذمت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اکٹھے رہنے اور

باہمی محبت و مودت کا حکم دیا ہے، تفرقہ و اختلاف سے روکا ہے اور نیکی و تقویٰ کے امور میں باہمی تعاون کو فرض قرار دیا ہے اور گناہ و زیادتی میں ایک دوسرے کی امداد سے منع فرمایا ہے۔" [مجموع الفتاوى: ۹۲/۱۱]

شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ مختلف اسلامی ممالک میں نوجوانوں کی اسلامی تربیت کے لیے اسلامی تنظیموں اور جماعتوں کا قیام شرعاً کیسا ہے اور کیا ایسا عمل دورِ حاضر کے مثبت امور میں سے ہے؟ شیخ صاحب نے جواب دیا:

"اس قسم کی اسلامی جماعتوں کا وجود مسلمانوں کے لیے باعث خیر ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ جماعتیں دلیل کے ساتھ حق کو واضح کریں اور اس کی دعوت دیں اور آپس میں نفرت نہ پھیلائیں بلکہ باہمی تعاون سے کام لیں اور ایک دوسرے سے محبت کا رشتہ قائم کریں اور خیر خواہی کا فرض بجا لائیں، دوسروں کی خوبیوں کو اجاگر کریں اور نفرت انگیزی سے کلی طور پر اجتناب کریں، اگر ان تمام امور کی پابندی کی جا سکتی ہو تو پھر کئی جماعتوں اور پارٹیوں کا وجود چنداں نقصان دہ نہیں ہے۔" [مجموع فتاوى ابن باز: ۲۷۲/۵]

انھوں نے مزید فرمایا: "کسی اسلامی ملک میں دینی جماعتوں کی کثرت میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ وہ سب خیر و بھلائی کے امور میں ایک دوسرے کی مدد کرنے والی ہوں اور اپنی اپنی خواہشات و مفادات کی پیروکار نہ ہوں۔ یقیناً ایسی صورت میں ان کی خیر و برکت اور فوائد بہت عظیم الشان ہوں گے۔"

علماء کی ان تصریحات کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ جماعتوں اور تنظیموں کا قیام کن شروط کے ساتھ مشروط ہے؟ اور تجربہ شاہد ہے کہ ان شرائط کی پابندی کے بغیر بنی ہوئی متعدد جماعتیں، کس قدر دینی نقصان کا سبب بنتی ہیں اور ان کی آپس میں تنقید و تضلیل [1] کے نتائج کیسے ہولناک ہوتے ہیں اور اس سے عوام کا دین اور علماء پر اعتماد کتنا کمزور ہوتا ہے اور

[1] تضلیل، کسی کو گمراہ قرار دینا۔

بات دین سے دوری کا کس طرح باعث بنتی ہے؟

علمائے اسلام کا فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کو آشکار کریں اور ہر جماعت و تنظیم سے بات چیت کر کے انھیں ایک دھارے پر لائیں اور اللہ کی راہ اور رسول ﷺ کے طریقے پر متحد کریں اور اگر وہ ذاتی مفادات اور نا معلوم مقاصد کی بنا پر علیحدگی کے لیے مصر ہوں تو اس سے لوگوں کو آگاہ کریں تا کہ ہر کوئی ان کی اصلیت اور حقیقت کو پہچان لے اور ان کا ساتھ دینے اور گمراہی کے راستے پر چلنے سے بچ جائے اور اس آیت کا مصداق بن جائے:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [الأنعام: ۱۵۳]

”اور یہ کہ یہی میرا راستہ ہے سیدھا، پس اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے، تا کہ تم بچ جاؤ۔“



ضمیمہ

کبائر کی بنیاد پر اہل اسلام کی تکفیر کرنا، ان کے خون و مال کو حلال کر لینا اور ان کے متفقہ حکمران کے خلاف مسلح بغاوت کرنا، خواہ وہ کسی بھی زمانے میں ہو۔

[كتاب الشريعة : ٢٤، الملل و النحل : ١٠٥/١، مجموع الفتاوى : ٢٧٩/٣]

خوارج کے اخلاقی ونظریاتی حمایتی، جو خود مسلم حاکم وقت کے خلاف مسلح تحریک میں عملاً شریک نہیں ہوتے مگر خوارج کے نظریات، مطالبات اور عملیات کو برحق قرار دیتے ہیں، ان کا شمار بھی خوارج ہی میں ہو گا۔

خوارج کی پشت پناہی کرنے والوں کے لیے "قَعَدِیہ" (عملاً بغاوت میں شریک نہ ہونے والے) اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور "قَعَدِیہ" خوارج ہی کا ایک گروہ ہے۔ یہ لوگ خوارج جیسے عقائد تو رکھتے تھے مگر خود مسلح بغاوت نہیں کرتے تھے بلکہ وہ خوارج کی پشت پناہی کرتے ہوئے اسے سراہتے تھے۔" [هدي الساري مقدمه فتح الباري : ٤٣٢]

اور قعدیہ (خوارج کی پشت پناہی کرنے والے) وہ لوگ ہیں جو بظاہر خود مسلح جنگ نہیں کرتے بلکہ حسب طاقت حکمرانوں کا انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو اپنی فکر ورائے کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مسلح بغاوت اور خروج کو (مذہب کا لبادہ اوڑھ کر) سراہتے ہیں اور باغیوں کو اس کی مزید ترغیب دیتے ہیں۔"

[تهذيب التهذيب : ١١٤/٨]

ہر وہ شخص یا گروہ، جس میں یہ صفات پائی جائیں اسے بھی ان کے ساتھ ملایا جائے گا۔

[مجموع الفتاوى: ٤٧٦/٢٨، ٤٧٧]

قرآن میں خوارج سے معاملے کا بیان:

سورۂ آل عمران میں فرمان باری تعالیٰ ہے:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے سوا کسی کو دلی دوست نہ بناؤ، وہ تمھیں کسی طرح نقصان پہنچانے میں کمی نہیں کرتے، وہ ہر ایسی چیز کو پسند کرتے ہیں جس سے تم مصیبت میں پڑو۔ ان کی شدید دشمنی تو ان کے مونہوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپا رہے ہیں وہ زیادہ بڑا ہے۔ بے شک ہم نے تمھارے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں، اگر تم سمجھتے ہو۔“ [آل عمران : ۱۱۸]

امام قرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد خوارج ہیں۔ وہ تمھارے درمیان فساد پھیلانے سے باز نہیں آئیں گے۔ اگر دہشت گردی نہ کر سکے تو مکر و فریب اور دھوکا بازی ترک نہیں کریں گے۔ [الجامع لاحكام القرآن للقرطبي : ۱۷۹/۴]

اسلامی ریاست کے خلاف مسلح بغاوت کی سزا:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”ان لوگوں کی جزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کی کوشش کرتے ہیں، یہی ہے کہ انھیں بری طرح قتل کیا جائے، یا انھیں بری طرح سولی دی جائے، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف سمتوں سے بری طرح کاٹے جائیں، یا انھیں اس سرزمین سے نکال دیا جائے۔ یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے۔“ [المائدة : ۳۳]

جس نے مسلم آبادی پر ہتھیار اٹھائے:

جس شخص نے شارع عام کو اپنی دہشت گردی کے ذریعے غیر محفوظ بنایا اور اس پر کنٹرول حاصل کر کے لوگوں کا پر امن طریقے سے گزرنا دشوار کر دیا۔ مسلمانوں کے حاکم کو اختیار ہے چاہے تو اسے قتل کرے، چاہے پھانسی دے اور چاہے تو حسب قانون کوئی اذیت

تاک سزا دے۔ [جامع البیان في تفسیر القرآن للطبري: ٦/ ٢١٤۔ تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر: ٢/ ٥١]

خوارج کے ساتھ جنگ: (خوارج کے ساتھ معاملہ، احادیث مبارکہ کی روشنی میں)

''اس شخص (ذوالخویصرہ) کی نسل سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے، وہ بت پرستوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کو قتل کریں گے۔ اگر میں انھیں پاؤں تو قوم عاد کی طرح ضرور بالضرور قتل کر دوں گا۔''

[مسلم: ١٠٦٣۔ بخاري: ٢٣٤٤]

خوارج سے قتال کرنے کے فضائل:

''عنقریب آخری زمانے میں ایسے لوگ ظاہر ہوں گے، جو نو عمر اور ناپختہ سمجھ لڑکے ہوں گے، وہ اسلامی تعلیمات پیش کریں گے لیکن ایمان ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین سے یوں خارج ہو جائیں گے جیسے تیر شکار سے جاتا ہے۔ پس تم (دورانِ جنگ) جہاں بھی انھیں پاؤ قتل کر دو، بے شک انھیں قتل کرنے والوں کو قیامت کے دن بڑا اجر ملے گا۔''

[بخاري: ٦٩٣٠۔ مسلم: ١٠٦٦]

خوارج کبھی دین کی طرف واپس نہیں آسکتے:

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''یقیناً یہ (ذوالخویصرہ) اور اس کے ساتھی قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے پھر وہ اس میں پلٹ کر واپس نہیں آئیں گے، یہاں تک کہ تیر پلٹ کر کمان میں نہ آ جائے۔ سو تم انھیں قتل کر دو، وہ بدترین مخلوق ہیں۔''

[مسند أحمد: ٣/ ١٥، ح: ١١١٢٤]

فتنہ خوارج کی عمر تھوڑی ہوتی ہے:

''میری امت میں مشرق کی جانب سے کچھ ایسے لوگ نکلیں گے جو قرآن پڑھتے ہوں گے لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا اور ان میں سے جو بھی گروہ نکلے گا وہ ختم کر دیا جائے گا یہاں تک کہ آپ ﷺ نے یوں ہی دس مرتبہ سے بھی زیادہ بار دہرایا اور فرمایا: '' ان میں سے جو بھی گروہ، جب بھی نکلے گا اسے کاٹ دیا جائے گا یہاں تک کہ ان کی باقی ماندہ نسل میں دجال نکلے گا۔''

[مسند أحمد : ۱۹۸/۲، ح : ٦٨٧١]



حرفِ دعا

میں اللہ سے دعا مانگتا ہوں کہ میری اس کاوش کو امت کے لیے سرمایۂ ہدایت بنا دے اور اس سے نوجوانانِ اسلام کو صراطِ مستقیم پر چلا دے اور امت مسلمہ کی بیداری میں اسے معاون بنائے۔

میں بارگاہِ الٰہی میں مزید دعا گو ہوں کہ وہ اس کتاب کو گمراہ کن افکار اور خوشنما و بلند بانگ دعووں کی آڑ میں باطل نظریات کی یلغار کے سامنے سدِ سکندری بنا دے۔

اللہ وحدہ لاشریک، چال باز دشمنوں کی تدابیر کو انھی پر پلٹا دے اور اپنے دین اور اس کے خادموں اور حامیوں کو سر بلند فرمائے۔ آمین!





خوارج کی نشانی

امام شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''گمراہ فکر لوگوں کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ وہ سلف میں سے ایسے علماء کی مذمت کرتے ہیں جو اپنے علم و فضل میں معروف و مشہور تھے اور ان کے ایسے مخالفین کی مدح سرائی کریں گے جو علمی پائے میں ان سے کم تر ہوں۔ دراصل یہ خصلتِ بد خوارج سے شروع ہوئی ہے، جب انھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بدگوئی کی اور انھیں کافر ٹھہرایا۔ حالانکہ ان کے بے شمار فضائل و مناقب خود زبانِ رسالت سے بیان ہوئے ہیں اور (یہ خوارج) عبد الرحمٰن بن ملجم جو کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قاتل ہے اس لعین کی تعریف کرتے ہیں، جبکہ سلف نے بالاتفاق اس کی مذمت کی ہے۔ لہٰذا آپ جب بھی کسی کو اس راہ پر چلتا دیکھیں تو سمجھ لیں کہ یہ شخص گمراہ فکر ہے۔'' [الاعتصام: ۷۴۰]



010051611

دار الاندلس

4-لیک روڈ چوبرجی لاہور
+92-42-37230549

غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
+92-42-37242314

بالمقابل سفاری پارک گلشن اقبال کراچی
+92-21-34835502

Head Office : Cell + 92-322-4006412 Email: dar_ul_andlus@yahoo.com